

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before taking it out. You will be responsible for damage to the book discovered while returning it.

DUE DATE

Cl. No. *Acc. No.*________________

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.


MUSLIM UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
DELHI

Registered No. L. 4186

جلد ۱۸ — عدد ۱

محرم ۱۳۶۰ھ

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت سالانہ عہ

قیمت فی پرچہ ۵ر

فہرست مضامین



(سلسلۂ سیاسی کشمکش حصہ سوم)

124118
11.7.9

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس میں طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن، مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور سے شائع ہوا

اصلی مسلمانوں کیلیے ایک ہی راہِ عمل

پہلے عرض کرچکا ہوں کہ اسلام تمام عالمِ انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملی اصلاح کا ایک انقلابی پروگرام لیکر آیا ہے۔ اُسکا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتیٰ کہ اُسکے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہوجائے۔ اور اسکا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتھا بنا کر اپنا پورا زور اس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں صرف کردیں، یہاں تک کہ اشخاص کی، خاندانوں اور طبقوں کی، قوموں اور نسلوں کی فرمانروائی اور جمہور کی حکومت خود اختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اُسکی رعیت پر صرف اُسی کا قانون عملاً جاری ہو۔ یہی پیغام اور یہی پروگرام انبیاء علیہم السلام ابتدا سے لیکر آتے رہے ہیں۔ اسی ایک مقصد پر انہوں نے اپنی تمام سعی و جہد کو مرکوز کیا ہے۔ اور مسلمان، جو انبیاء کے وارث اور انکے پیرو ہیں، اُنکے لیے بھی اِسکے سوا نہ کوئی دوسرا مقصد ہے اور نہ کوئی دوسری راہِ عمل۔ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ اپنے آپکو مسلم (یعنی متبعین انبیاء) کہنے کے باوجود انہوں نے اس نصب العین اور اس راہِ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کر رکھے ہیں جنکو اسلام سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

اُن لوگوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے علم سے بالکل ہی بے بہرہ ہیں، آج تک مجھے کوئی مسلمان، خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں ملا جس نے اس اعتراض کو سُن کر اصولی حیثیت سے صحیح تسلیم نہ کیا ہو۔ سب مانتے ہیں کہ بلاشبہ مسلمان کا اصلی کام یہی ہے اور اسی منزل کی طرف انبیاء علیہم السلام نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ لیکن جواب میں دو مختلف سمتوں سے دو مختلف آوازیں آتی ہیں:

"آزادی پسند"[1] علماء اور اُنکے ہم خیال مسلمان اس راستہ پر آنے کی مشکلات یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر صرف مسلمان آباد ہوتے، یا مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی، جیسی مصر ایران عراق وغیرہ ممالک میں ہے، تب تو ہمارے لیے آسان تھا کہ حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتے، اور اس صورت میں اسکے قائم ہونے کا امکان بھی تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ہم قلیل التعداد ہیں۔ اکثریت غیر مسلم ہے، حکومت الٰہیہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے، اور صرف مشترک وطنی حکومت ہی کے نصب العین تک اسکی نظر جا سکتی ہے۔ اوپر انگریزی حکومت بیٹھی ہے جو ہمیں اور غیر مسلم ہمسایوں کو بھی ایک ساتھ دبائے ہوئے ہے۔ خود مسلمانوں کی آبادی کا کثیر حصہ بھی اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے انتہائی تنزل کی حالت میں ہے۔ لہٰذا اسوقت جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مشترک حکومت کے نصب العین کو قبول کر کے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر، انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد آزاد ہندوستان میں ہم اپنی قوتوں کو پھر مجتمع کرینگے اور اپنے اصلی نصب العین کے لیے جدوجہد شروع کر دینگے۔ اسکے سوا اور کوئی راستہ اسوقت قابل عمل نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلم لیگ اور اُسکے ہم خیال لوگ اپنی مشکلات کو ایک دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں اول تو قلیل التعداد ہیں، پھر تعلیمی اور معاشی حیثیت سے ہماری قوت بہت کم ہے۔ اور مزید برآں ایک ایسی تنگ نظر اکثریت نے سیاسی اور معاشی قوتوں کے منابع پر تسلط حاصل کر لیا ہے جو عملاً تو ہم کو ایک الگ قوم سمجھ کر تعلیم حاصل کرنے اور پیٹ بھرنے کے ہر دروازے سے دور ہٹاتی ہے، مگر سیاسی اغراض کے لیے اصولاً ہمارے مستقل قومی وجود سے انکار کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ "ہم ہندوستانی قوم" میں شامل ہو کر یہاں ایک ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جانے دیں جس میں سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ محض ووٹوں کی کثرت ہو۔

[1] یہ بھی ایک طرفہ تماشا ہے کہ مغربی تصورات کی تقلید میں اب علماء تک آزادی اور غلامی کے الفاظ اس معنی میں استعمال کرنے لگے ہیں کہ غیر قوم کے تسلط میں ہونا غلامی اور اس سے نجات پا جانے کا نام "آزادی" ہے۔ حالانکہ اسلام کا تصور یہ نہیں ہے۔ اسلام کے نزدیک خدا کے سوا ہر ایک کی، حتیٰ کہ اپنی خواہش نفس کی بھی اطاعت غلامی ہے اور اس سے رہائی پا کر صرف خدا کا مطیع ہونا آزادی ہے۔

اس مقصد میں اسکے کامیاب ہوجانے کے معنی یہ ہونگے کہ ہم اپنی قومی شخصیت ہی کو سرے سے کھودیں، پھر بھلا حکومت الٰہیہ کا خواب کہاں دیکھا جاسکے گا۔ لہٰذا سردست اسکے سوا کوئی قابل عمل صورت نہیں ہے کہ جس طرح دنیا کی اور سب قومیں اپنی تنظیم کیا کرتی ہیں اسی طرح ہم بھی اپنی تنظیم کریں، اور دنیا میں جس طرح سیاسی لڑائی لڑی جاتی ہے اسی طرح ہم بھی لڑکر سب سے پہلے اُن علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی تصور جمہوریت کے تحت بنتا ہے، اپنی حکومت قائم کریں۔ بعد میں جب اختیارات ہمارے ہاتھ میں آجائینگے تو ہم مسلمانوں کی تعلیم اور انکی اخلاقی و تمدنی حالت کو درست کرکے رفتہ رفتہ حکومت جمہوریہ کو حکومت الٰہیہ میں تبدیل کرلینگے، اور اللہ نے چاہا تو پھر باقی ہندوستان کی بازیافت کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہینگے۔

بظاہر دونوں فریقوں کے خیالات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں ان میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہے، بلکہ خود یہی بات کہ حکومت الٰہیہ کے راستہ میں انکو اس نوعیت کی مشکلات نظر آتی ہیں، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انہوں نے اسلامی تحریک کے مزاج اور اس کے طریق کار (Technique) کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں، اگر اس تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو بادی النظر ہی میں ان عذرات کی غلطی نمایاں ہوجاتی ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی رسول آیا ہے، اکیلا ہی آیا ہے۔ اقلیت اور اکثریت کا کیا سوال ہے، وہاں سرے سے کوئی "مسلمان قوم" موجود ہی نہ تھی۔ ایک فی قوم بلکہ ایک فی دنیا کی حیرت انگیز اقلیت کے ساتھ رسول یہ دعویٰ لیکر اٹھتا ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنے آیا ہوں۔ چند گنے چنے آدمی اس کے ساتھ ہوجاتے ہیں اور یہ آٹے میں نمک سے بھی کم اقلیت، حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ اکثریت کا سمندر اسکے ساتھ جو کچھ سلوک کرتا ہے، اسکے مقابلہ میں ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کے اس قہر و تسلط کی سرے

سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جسکا نوحہ کرتے کرتے ہمارے "مسلم قوم پرست"[1] بھائیوں کے آنسو خشک ہوئے جا رہے ہیں۔ دفتروں کی ملازمت، منڈیوں کے کاروبار اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے معاملات کا کیا ذکر، وہاں سانس لینے کا حق بھی اس اقلیت کو نہیں دیا جاتا تھا۔ پھر حکومت، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، جس پنجۂ ظلم و شکنجۂ قہر میں انکو کستی تھی، اسکو کسی معنی میں بھی ہندوستان کے اُن انگریزی فرمانرواؤں کے برتاؤ سے تمثیل نہیں دی جاسکتی جنکے ظلم و جور کا رونا ہمارے "آزادی پسند" بھائی رات دن رویا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی کچھ ضروری نہ تھا کہ بہرحال رسول اور اصحاب رسول حکومت الٰہیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے ہوں۔ بارہا وہ اس مقصد میں ناکام ہوئے ہیں، انکو اور انکے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے، اور خدائی کے جھوٹے مدعیوں نے اپنی دانست میں اس تحریک کا قلع قمع کر کے چھوڑا ہے۔ مگر اسکے باوجود جو لوگ اللہ پر ایمان لائے تھے، اور جن کے نزدیک کرنے کا کام بس یہی تھا، انہوں نے آخری سانس تک اسی مقصد کے لیے کام کیا، اور کسی ایک نے بھی اکثریت کا یا حکومت کا رنگ دیکھ کر یا وقتی و مقامی مشکلات کا خیال کر کے دوسرے راستوں کی طرف ادنیٰ التفات تک نہ کیا۔

پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس تحریک کو اٹھانے اور چلانے کے لیے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے۔ جس سامان اور جس سازگاری کو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوا ہے نہ فراہم ہوگا۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے، اس قلبی شہادت کی ضرورت ہے کہ یہی مقصد حق ہے، اور اس عزم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اسی مقصد کے لیے ہے۔ یہ ایمان، یہ شہادت، یہ عزم موجود ہو تو دنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یہ اعلان کرنے کے لیے کافی ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اسکی پشت پر کسی منظم اقلیت یا کسی حکومت خود اختیاری رکھنے والی اکثریت کی قطعاً کوئی حاجت نہیں۔ نہ اس امر ہی کی کوئی حاجت ہے کہ اُس کا ملک پہلے بیرونی قوم کے تسلط سے آزاد ہو جائے۔ بیرونی قوم کیا، اور گھر کی قوم کیا، اللہ کے سوا دوسروں کی حاکمیت ماننے والے سب انسان اسکے لیے

[1] یعنی مسلم قومیت کے پرستار۔

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

یکساں ہیں۔ سب کی اس سے اور اسکی سب سے یکساں لڑائی ہے۔ مسیح سے رومیوں نے جو کچھ برتاؤ کیا، اس سے زیادہ ہولناک برتاؤ وہ تھا جو ابراہیمؑ سے انکی اپنی قوم نے کیا۔

یہ تو وہ بات ہے جو بادی النظر میں، ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہے۔ لیکن ذرا زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کی مشکلات کو یہ لوگ اپنی راہ میں حائل پا رہے ہیں وہ دراصل ایک قوم کی مشکلات ہیں نہ کہ ایک تحریک کی۔ جہاں ایک قوم اپنی زندگی اور اپنی قومی اغراض کے لیے جدوجہد کر رہی ہو وہاں تو بلاشبہ اسی قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اُسکے لیے ان سوالات میں بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ جس ملک میں وہ آباد ہے وہاں اسکی تعداد کتنی ہے؟ اس میں تنظیم ہے یا نہیں؟ اسکی تعلیمی حالت کیسی ہے؟ اسکی معاشی حالت کیسی ہے؟ اسکے اوپر ایک پتھر کا بوجھ ہے یا دو پتھروں کا؟ انہی سوالات کے جواب پر اسکا مستقبل منحصر ہوتا ہے، اور انہی سوالات کے لحاظ سے اسکو اپنی پالیسی متعین کرنی پڑتی ہے۔ مگر ایک اصولی تحریک جو کسی خاص قوم کی اغراض سے وابستہ نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے ایک دعوت لے کر اُٹھے، اسکے سامنے ان سوالات میں سے کوئی سوال بھی نہیں ہوتا۔ اُسکے مسائل کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اُسکی کامیابی و ناکامی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اسکے اصول بجائے خود معقول ہیں یا نہیں؟ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو کہاں تک حل کرتے ہیں؟ وہ بالعموم انسانی فطرت کو کس حد تک اپیل کرتے ہیں؟ اور اسکی طرف دعوت دینے والے خود اسکی پیروی میں کتنے مخلص اور کتنے صادق العزم ہیں؟

مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانی پیش آرہی ہے اسکی اصلی وجہ یہی ہے کہ انکے سوچنے والے دماغوں نے اپنی حیثیت کو ان دو مختلف حیثیتوں کے اندر خلط ملط کر دیا ہے۔ کبھی تو یہ اُن عزائم اور مقاصد کا اظہار کرتے ہیں جنکا تعلق اسلامی تحریک سے ہے، اور انکی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک اصولی تحریک کے پیرو اور داعی ہیں۔ اور کبھی یہ محض ایک قوم بنکر رہ جاتے ہیں، اُس طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح قومیں سوچتی ہیں، ایسے مسائل میں اُلجھ جاتے ہیں جو صرف قوموں ہی کو پیش آتے ہیں، اور اپنے اس طرزِ فکر کی وجہ سے اُن مشکلات کو

سدِّ راہ پاتے ہیں جو محض قومی مقاصد ہی کے لیے سدِّ راہ ہوا کرتی ہیں۔ اِن لوگوں نے آج تک اِن دونوں حیثیتوں کے فرق کو نہیں سمجھا، نہ واضح طور پر فیصلہ کیا کہ دراصل یہ ہیں کیا، اسی لیے یہ کوئی ایسی پالیسی ابھی تک اپنے لیے متعین نہ کر سکے جو تناقض سے خالی اور الجھاؤ سے پاک ہو۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابلِ تبلیغ چیزیں نہیں ہیں۔ مثلاً جرمنیت، اطالویت، انگریزیت، یا ہندوِیت کے متعلق کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ انکی طرف دوسروں کو دعوت دی جا سکتی ہے۔ یہ کوئی اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے انکو پیش کیا جا سکے۔ یہ تو نسل، تاریخ اور تمدن کے بنے ہوئے بے لچک دائرے ہیں۔ ان دائروں کے مفاد اور مقاصد سے جو کچھ بھی دلچسپی ہو سکتی ہے اُنہی لوگوں کو ہو سکتی ہے جو ان دائروں کے اندر پیدا ہوئے ہوں۔ دوسرے دائروں کے لوگوں کو ان سے دلچسپی ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک جرمن اپنی جرمنیت کی بنیاد پر کوئی کام کرنا چاہے تو لامحالہ وہ جرمنوں ہی سے ہمدردی و اعانت کی توقع کر سکتا ہے۔ انگریز کو کیا پڑی ہے کہ جرمنیت کی زندگی یا اسکی برتری کے معاملہ میں اسکا ساتھ دے۔ جرمنوں کا بول بالا کرنے کی تڑپ صرف جرمنوں ہی میں پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ انکے مقابلہ میں انگریز بھی متحد ہو کر اپنا بول بالا کرنے یا رکھنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ یہ تو ضرور ممکن ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے بعض افراد کو ناجائز ذرائع سے خرید کر اپنا آلہ کار بنا لیں، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریز جرمنیت پر ایمان لا کر جرمنوں کا حامی و حمیم بن جائے یا جرمن انگریزیت اختیار کر کے انگریزوں کا حامی و ناصر بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دو قوموں کے درمیان موافقت ہوتی ہے وہاں محض خود غرضی کی موافقت ہوا کرتی ہے اور صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک خود غرضی اسکی مقتضی ہو۔ اور جہاں انکے درمیان کشمکش و مزاحمت ہوتی ہے وہاں دونوں کو صرف اپنی قومی طاقت، اپنی تنظیم، اپنے معاشی وسائل، اپنی تعداد، اور اپنے آلاتِ جنگ ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے جو قوم کمزور ہو وہ پس جاتی ہے اور جو طاقتور ہو وہ اسے پیس ڈالتی ہے۔ جرمنی کے مقابلہ میں پولینڈ، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کیوں مغلوب ہو گئے؟ فن لینڈ اور رومانیا

کو روس اور جرمنی سے کیوں دبنا پڑا؟ اسی لیے کہ مقابلہ ایک قوم اور دوسری قوم کا تھا۔ دونوں طرف قومیتیں تھیں۔ لہٰذا جسکی قومیت تعداد اور آلات و وسائل اور تنظیم میں بڑھی ہوئی تھی اُس نے کمزور کو دبالیا۔ کوئی فریق بھی خالص انسانیت کی بنیاد پر ایسے اصول لے کر نہ اٹھا تھا کہ مخالف فریق کے انسانوں کو اپیل کرتا اور یہ ممکن ہوتا کہ خود دشمنوں میں سے اسکو دوست ملتے چلے جاتے۔

یہ ہوتی ہے ایک قوم کی حیثیت۔ اب غور کیجیے کہ فی الحقیقت کیا مسلمانوں کی حیثیت اس دنیا میں یا اس ہندوستان میں یہی ہے؟ کیا ہم محض نسل، تاریخ اور موروثی تمدن کا بنایا ہوا ایک ایسا گروہ (Group) ہیں جسکی قومیت دنیا کی تمام قومیتوں کی طرح ناقابلِ تبلیغ ہو؟ کیا ہمارے مقاصد کی نوعیت بھی اپنی قومی اغراض و مقاصد کی سی ہے جن پر دوسری قوموں کا ایمان لانا فطرۃً غیر ممکن ہوتا ہے؟ کیا ہمارے مقاصد اُسی قسم کے قومی مقاصد ہیں جنکا حصول صرف ایک قوم کی تعداد، تنظیم اور وسائل ہی پر موقوف ہوتا ہے؟ کیا وہ اسلامی حکومت جس کا ہم نام لیا کرتے ہیں محض ایک قومی ریاست (National state) ہے جسکے قیام کی بنیاد ایک قوم کی کثرت تعداد ہوا کرتی ہے؟ کیا قلیل التعداد ہونے کی صورت میں ہماری حیثیت واقعی ایک قومی اقلیت (National minority) کی رہ جاتی ہے جسکے لیے اکثریت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے یا اپنی انفرادیت کے تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنیکے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا؟ کیا حقیقت میں دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہمارے لیے بھی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ غیر قوم کی حکومت سے نجات حاصل ہو جائے؟ اور کیا اپنی قوم کی حکومت یا اپنے اہلِ وطن کی حکومت قائم ہو جانا ہمارے مقاصد کے لیے بھی ضروری ہے؟

اگر واقعی یہی ہماری حیثیت ہے، تو بلاشبہ وہ سب کچھ صحیح ہے جو مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اسوقت کر رہی ہیں۔ غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد بھی صحیح، برطانوی حکومت اور دیسی ریاستوں کا سہارا لیکر ہندو امپیریلزم کا مقابلہ بھی صحیح، فوج میں اور سرکاری ملازمتوں میں اور انتخابی مجالس میں اپنی نمائندگی کا جھگڑا بھی صحیح، مسلم ریاستوں کی حمایت بھی صحیح، تقسیم ملک کا مطالبہ بھی صحیح، خاکساروں کی فوجی تنظیم بھی صحیح، اور وہ مسلم قوم پرستی

بھی صحیح جسکی بنا پر حق اور اصول سے قطع نظر کرکے ہر اُس فائدے کو دانتوں سے پکڑا جاتا ہے جو مسلمان قوم یا مسلمان اشخاص کو حاصل ہوتا ہو۔ غرض یہ سب کچھ صحیح ہے کیونکہ قومیت کا آئین یہی ہے اقومیں یونہی کام کیا کرتی ہیں، اور ایک قوم جو کسی اصول کی علمبردار نہیں بلکہ محض اپنی قومی بہتری کی خواہشمند ہو، ان تدابیر کے سوا آخر اور کیا تدابیر اختیار کرسکتی ہے؟ البتہ ان سب چیزوں کے ساتھ اگر کوئی بات غیر صحیح ہے تو وہ ہماری یہ خوش فہمی کہ یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد بھی ہم اس زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کرسکیں گے حالانکہ اس حیثیت میں یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔

دراصل ایک ملک پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر چھا جانے کی قوت اگر ہے تو وہ صرف ایک ایسی اصولی تحریک ہی میں ہے جو انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہو اور اسکے سامنے خود اسکی اپنی فلاح کے فطری اصول پیش کرتی ہو۔ قومیت کے برعکس ایسی تحریک ایک تبلیغی طاقت ہوتی ہے۔ قومیت کے حصار، نسلوں کے تعصبات، قومی ریاستوں کے مضبوط بند، کوئی چیز بھی اسکا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ ہر طرف، ہر جگہ نفوذ کرتی چلی جاتی ہے۔ اسکی طاقت کا انحصار اپنے پیروؤں کی تعداد یا انکے وسائل پر نہیں ہوتا۔ ایک اکیلا آدمی اسکو چلانے کے لیے کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنے اصولوں کی طاقت سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں میں سے دوست پیدا کرتی ہے۔ سب قوموں میں سے آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر اُسکے جھنڈے کے نیچے آنے لگتے ہیں اور وسائل اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ جو فوجیں اس سے لڑنے آتی ہیں ان پر وہ صرف اپنی توپ و تفنگ سے ہی آتش باری نہیں کرتی بلکہ اپنی تعلیم اور اپنے اصولوں کے تیر بھی چلاتی ہے۔ خود اپنے دشمنوں میں سے وہ اپنے سرگرم حامی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ سپاہی، جنرل، ماہرین فنون، سرمایہ دار، صناع اور کاریگر سب انہی میں سے اسکو مل جاتے ہیں اور بے سروسامانی میں سے ہر قسم کا سامان نکلتا چلا آتا ہے۔ قومیتیں اسکے سیلاب کے مقابلہ میں کبھی نہیں ٹھیر سکتیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اسکے سامنے آتے ہیں اور نمک کی طرح گھل گھل کر اس آب رواں میں جذب ہوتے جاتے ہیں۔ اُسکے لیے اقلیت اور اکثریت کے سارے سوالات بے معنی ہیں۔ وہ

اسکی ہرگز محتاج نہیں ہوتی کہ کسی منظم اور باوسیلہ قوم کی طاقت اُسکی پشت پر ہو۔ وہ قومی حکومت قائم کرنے نہیں اٹھتی کہ قومیں اس کی مزاحمت کر سکیں۔ اُسے تو ایک ایسے اصول کی حکومت قائم کرنی ہوتی ہے جو سب قوموں کے لوگوں کی فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ جاہلی تعصبات کچھ دیر تک اس سے لڑتے رہتے ہیں، مگر جب فطرت انسانی پر لگا ہوا زنگ چھوٹتا ہے تو وہ کیفیت ہوتی ہے کہ

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بامید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

مسلمان قرآن اور سیرت رسول کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں۔ جس چیز کی وجہ سے وہ اپنے آپکو مسلمان کہتے ہیں، کہیں وہ اسی نوع کی تحریک تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ قوموں کے درمیان رہتے رہتے اور انہی جیسی تعلیم و تربیت پاکر اپنی اصلی حیثیت بھول گئے ہوں اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو قوم کہتے کہتے وہ سب محدودیتیں بھی انھوں نے اپنے خیال میں خود اپنے اوپر عائد کرلی ہوں جو ایک قلیل الوسائل قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔

اگر واقعہ یہی ہے اور مسلمانوں کی اصلی حیثیت ایک عالمگیر اصولی تحریک کے پیروؤں اور داعیوں کی ہے تو وہ سارے مسائل یک قلم اُڑ جاتے ہیں جن پر اب تک مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی رہنما وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ پوری صورت حال بالکل بدل جاتی ہے مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیت العلماء اور آزاد کانفرنس، سب کی اس وقت تک کی تمام کارروائیاں حرف باطل کی طرح محو کر دینے کے لائق ٹھیرتی ہیں۔ نہ ہم قومی اقلیت ہیں، نہ آبادی کے فی صدی تناسب پر ہمارے وزن کا انحصار ہے، نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے، نہ وہ حکومت ہمارے کسی کام کی ہے جو انگریزی حاکمیت کے بجائے جمہور کی حاکمیت پر مبنی ہو، نہ اُن ایوانوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں، نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے،

نہ اکثریت کی بنا پر ہمیں قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں، بندوں کی حاکمیت ختم ہو جائے اور حکومت اُس قانونِ عدل کی قائم ہو جو اللہ نے خود بھیجا ہے۔ اس مقصد کو ہم انگریز، والیانِ ریاست، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور مردم شماری کے مسلمان، سب کے سامنے پیش کرینگے۔ جو اسے قبول کرے گا وہ ہمارا رفیق ہے، اور جو اس سے انکار کرے گا اس سے ہماری لڑائی ہے بلالحاظ اس کے کہ اس کی طاقت کتنی ہے اور ہماری کتنی۔

یہ حیثیت اختیار کرنے اور اس تحریک کو لے کر اُٹھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے شخصی اور قومی مفاد و اغراض کو بھول جائیں، تمام تعصبات سے بالاتر ہو جائیں، اور اُن چھوٹی چھوٹی چیزوں سے نظر ہٹالیں جن سے ہمارے حقیر دنیوی فوائد کا تعلق ہے۔ اگر ہم میں ہندوستانیت کا تعصب ہوگا تو فطری بات ہے کہ انگریز اور ہر غیر ہندوستانی کے کان ہماری دعوت کے لیے بہرے ہو جائیں۔ اگر ہم نام نہاد مسلم قومیت کے تعصب میں مبتلا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو یا سکھ یا عیسائی کے دل کا دروازہ ہماری پکار کے لیے کھل جائے۔ اگر ہم حیدر آباد، بھوپال، بہاول پور اور رام پور جیسی ریاستوں کی حمایت محض اس لیے کریں کہ انکے رئیس مسلمان ہیں اور ان سے مسلمانوں کو کچھ معاشی سہارا مل جاتا ہے تو کوئی احمق ہی ہوگا جو اسکے بعد بھی یہ باور کرلیگا کہ ہم اسلام کے نظریۂ سیاسی پر ایمان رکھتے ہیں اور واقعی حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ اگر ہم غیر مسلم حکومت کی ملازمت اور غیر اسلامی جمہوری ادارات میں مسلمانوں کی نمائندگی پر جھگڑا کریں تو ہماری اس آواز میں کوئی وزن باقی نہ رہے گا کہ ہم اصولِ اسلام کی فرمانروائی قائم کرنے اُٹھے ہیں۔ اگر ہم تناسب آبادی کے لحاظ سے تقسیمِ ملک کا مطالبہ کریں تو غیر مسلموں کو ہم میں اور خود اپنے آپ میں سرے سے کوئی فرق ہی محسوس نہ ہوگا کہ وہ اپنا مقام چھوڑ کر ہماری دعوت پر لبیک کہنے کی کوئی ضرورت سمجھیں۔ اگر ہم غیر اسلامی اصول پر مشترک

دینی حکومت قائم کرنے میں حصہ لیں تو ہمارے اس فعل میں اور ہماری اُس دعوت میں ایسا صریح تناقض ہوگا کہ ہماری صداقت کیا معنی، صحت عقل تک مشتبہ ہو کر رہ جائیگی۔ اس راستہ پر چلنے کے لیے ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ بلاشبہ اس سے ہمیں بہت نقصانات پہنچیں گے، مگر ایسے نقصانات اٹھائے بغیر اسلامی تحریک کبھی چلی ہے نہ کبھی چل سکتی ہے۔ جو کچھ جاتا ہے جانے دو۔ سیدنا مسیح کے بقول جبہ جاتا ہے تو کرتا بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو سکے گی۔

اسلام کی راہِ راست اور اس سے انحراف کی راہیں

مسلمانوں میں سے جو لوگ پاکستان کے نصب العین پر اپنی نظر جمائے ہوئے ہیں، اور جو انگریزی حکومت سے ہندوستان کی آزادی پر اپنی آئندہ کی تمام امیدوں کا انحصار رکھتے ہیں، اور جو ان دونوں کے درمیان مختلف راہیں تلاش کر رہے ہیں، ان سب کے اندر ایک چیز مجھے مشترک نظر آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف براہ راست پیش قدمی کرنے سے یہ سب لوگ جھجکتے ہیں۔ مشکلات کا ایک بہت بڑا پہاڑ انکو اس راستے میں حائل نظر آتا ہے اور اس کو دور سے دیکھ کر یہ دائیں یا بائیں جانب مڑ جاتے ہیں تاکہ پھیر کے راستوں سے نکل جائیں۔ حالانکہ میں علی وجہ البصیرت یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی نصب العین تک کسی پھیر کے راستے سے پہنچنا غیر ممکن ہے۔ اسکی طرف اگر پیش قدمی کی جاسکتی ہے تو براہِ راست ہی کی جاسکتی ہے، اور جو مشکلات اس راستہ میں نظر آتی ہیں وہ ناقابلِ عبور نہیں ہیں بلکہ ہر وقت قابلِ عبور ہیں بشرطیکہ انکو صحیح طور سے سمجھنے اور دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اوپر کے فقرے میں جو مجمل دعوے میں نے کیا ہے اب میں اس کا تجزیہ کر کے ایک ایک جز پر الگ الگ بحث کرونگا۔

۱- اصل اسلامی نصب العین کیا ہے؟

۲- اسکی طرف پیش قدمی کا سیدھا راستہ کونسا ہے؟

۳- اس راستہ میں جو مشکلات نظر آتی ہیں وہ کیا ہیں؟

۴- ان مشکلات کو دیکھ کر پھیر کے راستے کونسے اختیار کیے جا رہے ہیں؟

۵- ان مختلف راستوں میں غلطی کیا ہے اور یہ اصل مقصود تک کیوں نہیں پہنچا سکتے؟

۶- یہ مشکلات کی حقیقی نوعیت کیا ہے اور وہ کس طرح دور ہو سکتی ہیں؟

یہ سوالات ہیں جن پر مجھے اس مضمون میں مختصراً بحث کرنی ہے۔

۱- اسلامی نصب العین

پہلے سوال کا جواب قرآن مجید میں جو کچھ دیا گیا ہے وہ یہ ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

"وہی ہے (یعنی اللہ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسکو پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ یہ کام مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو"

اس آیت میں الھدیٰ (ہدایت) سے مراد دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ ہے انفرادی برتاؤ، خاندانی نظام، سوسائٹی کی ترکیب، معاشی معاملات، ملکی انتظام، سیاسی حکمت عملی، بین الاقوامی تعلقات، غرض زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسان کی زندگی کے لیے صحیح رویہ کیا ہونا چاہیے، یہ چیز اللہ نے اپنے رسول کو بتا کر بھیجا ہے۔

دوسری چیز جو اللہ کا رسول لے کر آیا ہے وہ دین حق ہے۔ دین کے معنی اطاعت کے ہیں کیش اور مذہب کے لیے جو دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے یہ اس کا اصل معنی موضوع لہ نہیں ہے بلکہ اسکو دین اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں بھی انسان خیال و عمل کے ایک خاص سسٹم کی اطاعت کرتا ہے۔ ورنہ دراصل دین کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانہ حال میں لفظ "سٹیٹ" کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اسکی اطاعت کرنا، یہ "اسٹیٹ" ہے۔ یہی دین کا مفہوم بھی ہے، اور "دین حق" یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی اور تمام مخلوقات کی بندگی و اطاعت چھوڑ کر صرف اللہ کے

اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اُسی کی بندگی و اطاعت اختیار کرے ۔ پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک ایسے "اسٹیٹ" کا نظام لے کر آیا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے، نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام، بلکہ حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لیے ہے ۔

پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اس نظامِ اطاعت (دین) اور اس قانونِ حیات (الھدیٰ) کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے ۔ پوری جنسِ دین سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر جن جن صورتوں سے کسی کی اطاعت کر رہا ہے وہ سب جنسِ دین کی مختلف انواع ہیں ۔ بیٹے کا والدین کی اطاعت کرنا، بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا، نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا، ماتحت کا افسر کی اطاعت کرنا، رعیت کا حکومت کی اطاعت کرنا، پیروؤں کا پیشواؤں اور لیڈروں کی اطاعت کرنا، یہ اور ایسی ہی دوسری بے شمار اطاعتیں بحیثیت مجموعی ایک نظامِ اطاعت بناتی ہیں اور اللہ کی طرف سے رسول کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پورا نظامِ اطاعت اپنے تمام اجزا سمیت ایک بڑی اطاعت اور ایک بڑے قانون کے ماتحت ہو جائے، تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں، اُن سب کو منضبط (Regulate) کرنے والا ایک اللہ ہی کا قانون ہو، اور اُس بڑی اطاعت اور اُس ضابطۂ قانون کی حدود سے باہر کوئی اطاعت باقی نہ رہے ۔

یہ رسول کا مشن ہے اور رسول اس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے، خواہ شرک کرنے والے اس پر کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں ۔ شرک کرنے والے کون ہیں؟ وہ سب لوگ جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری مستقل بالذات (یعنی خدا کی اطاعت سے آزاد) اطاعتیں شریک کرتے ہیں ۔ جہاں تک اللہ کے قانونِ طبیعی (Law of nature) کا تعلق ہے، ہر انسان طوعاً و کرہاً اس کی اطاعت کر رہا ہے کیونکہ اس اطاعت کے بغیر تو اُس کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں ہے ۔ مگر جہاں تک انسان کے دائرۂ

اختیار کا تعلق ہے، اس دائرے میں بعض انسان تو بالکل ہی غیر اللہ کے مطیع بن جاتے ہیں اور بعض انسان اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے کسی حصہ میں خدا کے بھیجے ہوئے قانونِ اخلاق (شریعت) کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی دوسرے حصہ میں اپنے نفس کی یا دوسروں کی اطاعت کرتے ہیں۔ اسی چیز کا نام اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری اطاعتوں کو شریک کرنا ہے، اور جو لوگ شرک کی ان مختلف صورتوں میں مبتلا ہیں، اُن کو یہ بات ناگوار ہوتی ہے کہ اپنی فطری اطاعت کی طرح اپنی اختیاری اطاعت و بندگی کو بھی بالکلیہ اللہ کے لیے خالص کر دیں۔ خواہ نادانی کے سبب سے، یا اخلاقی کمزوری کے سبب سے، بہرحال وہ شرک پر اصرار کرتے ہیں، لیکن اللہ کے رسول پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی مزاحمت کے باوجود وہ اپنے مشن کو پورا کرے۔

۲- اسلامی نصب العین تک پہنچنے کا سیدھا راستہ

یہ ہے اسلامی نصب العین، اور اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے راہِ راست وہی ہے جو اللہ کے رسول نے اختیار کی، یعنی یہ کہ لوگوں کو "الھدیٰ" اور "دینِ حق" کی طرف دعوت دی جائے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک کرنا چھوڑ دیں، اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنا لیں اُن کا ایک مضبوط جتھا بنایا جائے۔ پھر یہ جتھا تمام اُن اخلاقی، علمی اور مادّی ذرائع سے جو اس کے امکان میں ہوں، دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے جہادِ کبیر کرے یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری اطاعتیں جن جن طاقتوں کے بل پر قائم ہیں اُن سب کا زور ٹوٹ جائے اور پورے نظامِ اطاعت پر وہی الھدیٰ اور دینِ حق غالب ہو جائے۔

اِس راہِ راست کا ہر جز قابلِ غور ہے:

پہلا جز یہ ہے کہ انسانوں کو بالعموم اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے

قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ یہ دعوت عام ہونی چاہیے۔ ہر وقت جاری رہنی چاہیے اور اسکے ساتھ دوسری غیر متعلق باتوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیے۔ قوموں اور نسلوں اور ملکوں کے باہمی جھگڑے، خود اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی بحثیں، غیر الٰہی نظامات میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا، یا کسی ایسے نظامِ فاسد کی خود غرضانہ حمایت کرنا، یا کسی نظامِ فاسد میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرنا، یہ سب چیزیں نہ صرف یہ کہ الھدیٰ اور دینِ حق کی دعوت کے ساتھ میل نہیں کھاتیں بلکہ صریح طور پر اس کے منافی اور اسکے لیے مضرت رساں ہیں۔ پس جب کسی شخص یا گروہ کو دعوتِ حق کی خدمت انجام دینی ہو تو اسے اِن تمام جھگڑوں اور بحثوں سے الگ ہو جانا چاہیے اور اپنی دعوت کے ساتھ کسی دوسرے غیر متعلق اور بے جوڑ قضیے کو شامل نہ کرنا چاہیے۔

دوسرا جزء یہ ہے کہ جتھا صرف اُن لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان کر اور سمجھ کر قبول کریں، جو بندگی و اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں، جو دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ واقعی شریک کرنا چھوڑ دیں اور حقیقت میں اللہ کے قانون کو اپنا قانونِ زندگی بنا لیں۔ رہے دوسرے لوگ جو اس طرزِ خیال یا اس طرزِ زندگی کے محض معترف ہوں، یا اس سے ہمدردی رکھتے ہوں، تو وہ مجاہدہ کرنے والے جتھے کے لیڈر کیا معنی، کارکن بھی نہیں بن سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ جو جس درجہ میں بھی ہمکا ہمدرد یا بیرونی معاون بن جائے بسا غنیمت ہے، مگر ارکان اور ہمدردوں کے درمیان جو بنیادی فرق و امتیاز ہے اُسے کسی حال میں نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

تیسرا جزء یہ ہے کہ براہِ راست غیر الٰہی نظامِ اطاعت پر حملہ کیا جائے، تمام کوششوں کا مقصود صرف اس ایک بات کو بنایا جائے کہ اللہ کی حاکمیت قائم ہو، اور اسکے سوا کسی دوسری چیز کو مقصود بنا کر اسکے پیچھے قوتیں ضائع نہ کی جائیں۔

۳۔ مشکلات

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی مستقل سیاسی جماعتیں ہیں، قریب قریب اُن سب کا

دعویٰ یہی ہے کہ ہمارا نصب العین اسلامی نصب العین ہی ہے، مگر ان سب نے اُس راہِ راست کو چھوڑ دیا ہے جسکی تشریح ابھی میں نے بیان کی ہے۔ وہ نہ تو "الھدیٰ" اور "دینِ حق" کی خالص، بے آمیز دعوتِ عام دیتی ہیں۔ نہ اُس پارٹی کی تشکیل کرتی ہیں جسکی قیادت و رکنیت صرف اُن لوگوں تک محدود ہو جو واقعی اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خاص کرتے ہوں۔ اور نہ وہ غیر متعلق مقاصد کو چھوڑ کر صرف اُس ایک مقصد کو اپنی کوششوں کا ہدف بناتی ہیں جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ راہِ راست کے اِن تینوں اجزاء سے یہ سب جماعتیں منحرف ہو گئی ہیں۔

اس انحراف نے مختلف جماعتوں کے مسلک میں کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں؟ اسکی تفصیل میں بعد میں بیان کرونگا۔ پہلے میں اس انحراف کا سبب بتا دینا چاہتا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کو اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے میں تین بڑی زبردست مشکلات نظر آتی ہیں جنکا کوئی حل انکی سمجھ میں نہیں آتا۔

(۱) سب سے پہلی مشکل جو انکے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ الھدیٰ اور دینِ حق کی طرف دعوت عام کا نتیجہ خیز اور کامیاب ہونا موجودہ حالات میں انکو محال نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسری تحریکیں تو محض سیاسی، تمدنی اور معاشی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں اور جن لوگوں کو انکا تجویز کردہ حل اپیل کرتا ہے وہ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کیے بغیر اُن تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام محض دنیوی مسائل کا حل ہی پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد کا ایک نظام اور عبادات اور قوانین شرعیہ کا ایک ضابطہ بھی پیش کرتا ہے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ لوگ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کر دیں۔ پھر یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ اسلام کی دعوتِ عام اُس طرح پھیل سکے گی جس طرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں۔

(۲) دوسری مشکل جو اس راستہ میں انہیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف لوگوں میں شدید تعصبات پھیلے ہوئے ہیں۔ انکا خیال یہ ہے کہ دوسری تحریکوں کا پھیلنا آسان ہے کیونکہ اُنکے خلاف تعصبات

موجود نہیں ہیں، مگر اسلام کا پھیلنا مشکل ہے کیونکہ اس کا نام سنتے ہی ماضی اور حال کے تعصبات کا ایک طوفان اُٹھ جاتا ہے۔

(۳) تیسری مشکل اُنکی نگاہ میں یہ ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی ایک قوم یہاں موجود ہے جو "قومیت" کے اعتبار سے تو "مسلمان" ہے، مگر اسکا اخلاقی مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے کہ وہ اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کر سکے۔ اس قوم کو لے کر اُس راستہ پر چلنا چاہیں تو چل نہیں سکتے۔ اسکو چھوڑ کر چلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور پھر یہ سوال بھی دماغ کو پریشان کرتا ہے کہ اگر تمام مقاصد کو نظر انداز کر کے صرف ایک الٰہی حکومت کے مقصد پر توجہات مرکوز کر دی جائیں تو آخر موجودہ سیاسی حالات اور آئندہ کے دستوری تغیرات میں "مسلمانوں" کے قومی مفاد کا کیا حشر ہو گا۔

۴۔ انحراف کی راہیں

یہی تین مشکلات ہیں جنکو اس راہ میں حائل دیکھ کر لوگ دائیں اور بائیں رخ پر راستہ کترا کر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جزئیات کے اعتبار سے مختلف لوگوں کے نظریات اور عملی طریقوں میں جو اختلافات ہیں انکو نظر انداز کر کے بڑی اور اصولی تقسیم اگر کی جائے تو یہ سب تین گروہوں میں منقسم ہو جاتے ہیں:

ایک وہ گروہ جو کہتا ہے کہ پہلے ہمیں ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے ساتھ موافقت کر کے اس ملک کو انگریزی اقتدار سے آزاد کرا لینا چاہیے تاکہ یہاں ایک مشترک جمہوری اسٹیٹ قائم ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم بتدریج اُس اسٹیٹ کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرنے کے لیے کوشش کرینگے۔

دوسرا وہ گروہ جس کا خیال یہ ہے کہ پہلے انگریزی اقتدار کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ہمیں مستقل ہندو اکثریت کے تسلط کا سدِ باب کرنا چاہیے، اور ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس ملک میں ایک

جمہوری اسٹیٹ کے بجائے دو اسٹیٹ قائم ہوں، ایک وہ اسٹیٹ جس میں مسلم اکثریت کی وجہ سے اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے اور دوسرا وہ اسٹیٹ جس میں ہندو اکثریت کی وجہ سے اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں جائے مگر زیادہ سے زیادہ جو آئینی تحفظات ممکن ہیں اُنکے ذریعہ سے مسلمانوں کی پوزیشن محفوظ ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد ہم مسلم اکثریت والے اسٹیٹ کو بتدریج اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرینگے اور پھر ہندو اکثریت والے اسٹیٹ میں تغیر و اصلاح کی کوشش کرینگے۔

تیسرا وہ گروہ جو موجودہ حالات میں دعوتِ عام اور ایک انقلابی پارٹی کی تشکیل کو آسان بنانے کے لیے اسلام کو ایک دوسرے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے تاکہ وہ اُن لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہو جائے جو اسلامی عقائد اور عبادات اور نظامِ شریعت کی بندشوں سے گھبراتے ہیں۔ اس گروہ نے اگرچہ ابھی کوئی مستقل جماعتی صورت نہیں اختیار کی ہے، مگر مجھے معلوم ہے کہ اس طرزِ خیال کے لوگ ایک اچھی خاصی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں اور انکی تجویزیں اس وقت حالاتِ جنینی (Embryonic stage) سے گذر رہی ہیں۔

۵۔ منحرف راستوں کی غلطی

اب میں ان میں سے ایک ایک گروہ کے طریقہ پر الگ الگ تنقید کر کے بتاؤنگا کہ ان طریقوں میں غلطی کیا ہے، ان میں سے ہر ایک نے اسلام کی راہِ راست سے کس طرح انحراف کیا ہے، اور ان پھیر کے راستوں سے اصل اسلامی نصب العین تک پہنچنا ابداً غیر ممکن اوقوع کیوں ہے۔

"آزادیِ ہند" کو مقدم رکھنے والے | پہلا گروہ زیادہ تر علماء اور مذہبی خیالات کے لوگوں پر مشتمل ہے اور بالعموم اس گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کی بہ نسبت زیادہ مذہبی ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کے انحراف پر مجھ کو سب سے زیادہ افسوس ہے۔ ان حضرات نے مذکورہ بالا مشکلات سے خوف زدہ ہو کر یہ خیال قائم کر لیا کہ موجودہ حالات میں اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی نہیں کی جا سکتی اس لیے

انہوں نے اپنی کوششوں کا مقصود یہ ٹھیرایا کہ ہندوستان انگریزی اقتدار سے آزاد ہو جائے۔ مقصود بدل جانے سے لامحالہ راستہ بھی بدل گیا۔ اسلام کی راہِ راست کے تین اجزا جو میں نے ابتدا میں بیان کیے ہیں، اِن کا راستہ ہر جزو میں اس سے مختلف ہے:

(۱) دعوت کے باب میں اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کی طرف بلایا جائے۔ مگر یہ ہندوستان کے باشندوں کو اس طرف بلاتے ہیں کہ تم خود مالک الملک بنو۔ یہ غیر الٰہی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی نہیں کرتے بلکہ صرف انگریزی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی کرتے ہیں۔ اور یہ الٰہی اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات بھی نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ باشندگانِ ملک کی خود اختیاری اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرک ہونے کی حیثیت سے انگریزی اقتدارِ اعلیٰ اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی دعوت سراسر غیر اسلامی بلکہ مخالفِ اسلام دعوت ہے۔

ان کے نزدیک انگریزی اقتدار کے مقابلہ میں جمہورِ اہلِ ہند کا اختیار، اور انگریزی شریعت کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کی قانون سازی قابلِ ترجیح ہے، حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دونوں یکساں بغاوت، یکساں کفر اور یکساں طغیان و معصیت ہیں۔

پھر یہ انگریز اور ہندوستانی کے درمیان قومی و وطنی عداوت و تعصب کی آگ بھڑکانے میں حصہ لیتے ہیں، حالانکہ اسلام کی دعوتِ عام کے راستہ میں یہ رکاوٹ ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انگریز اور ہندوستانی دونوں انسان ہیں۔ وہ دونوں کو یکساں اپنی دعوت کا مخاطب بناتا ہے۔ اس کا جھگڑا انگریز سے اس بات پر نہیں ہے کہ وہ ایک ملک کا باشندہ ہو کر دوسرے ملک پر حکومت کیوں کرتا ہے۔ بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ خدا کی حاکمیت اور اس کے قانون کی اطاعت کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ بعینہٖ اسی بات پر اس کا جھگڑا ہندوستانی سے بھی ہے۔ وہ دونوں کو ایک ہی بات کی طرف بلاتا ہے۔ ایک کا حامی بن کر دوسرے سے لڑنا اس کی حیثیت کے منافی ہے کیونکہ اگر وہ ہندوستانی اور انگریز کے وطنی و قومی جھگڑے میں

ایک کا طرف دار اور دوسرے کا مخالف بن جائے[1] تو انگریز کے دل کا دروازہ اُس کی دعوت کے لیے بند ہو جائیگا۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ ایک طرف اسلام کے داعی بنتے ہیں اور دوسری طرف اس وطنی و قومی جھگڑے میں فریق بھی بنتے ہیں وہ دراصل اسلام کے مفاد کو ہندوستانیت کے مفاد پر قربان کرتے ہیں۔

ان تمام بنیادی غلطیوں کے ساتھ یہ حضرات کبھی کبھی اسلام کی تبلیغ بھی فرمایا کرتے ہیں۔ مگر ایسی تبلیغ کبھی مؤثر نہیں ہو سکتی۔ ایک ساز سے دو بالکل مختلف آوازیں سُن کر اور ایک زبان سے دو قطعی متضاد باتیں سماعت کر کے آخر کون متأثر ہو سکتا ہے؟

(۲) تشکیل جماعت کے باب میں یہ حضرات اس سے بھی زیادہ مختلط ہیں۔ اول تو دعوت کی نوعیت بدل جانے کی وجہ سے خود ہی جماعت کی ترکیب اور اجزائے ترکیبی کے متعلق انکا نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ دوسرے "مسلمان قوم" کے تخیل نے پریشان خیالی کے لیے ایک اور وجہ بھی پیدا کر دی ہے۔ ان اسباب سے یہ ہر قسم کے رطب و یابس آدمی اکٹھے کر لیتے ہیں، اور ان آدمیوں کے اقوال و افعال میں بیک وقت بیسیوں قسم کی متضاد بیانوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک متحد المزاج نظریہ کی حمایت کے لیے آپ اٹھیں تو لامحالہ آپ اپنی پارٹی کے لیے اپنی آدمیوں کا انتخاب کرینگے جو یکسوئی کے ساتھ اُس خاص نظریہ کے متبع ہوں بخلاف اسکے ایک مخلوط اور غیر معین مزاج رکھنے والے نظریہ کو لے کر جب آپ اٹھینگے تو آپ کا معیار انتخاب اکثر اُن قیود سے آزاد ہو جائیگا جو متحد المزاج نظریہ کے لیے ناگزیر ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے مجھے ایک مجلس

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر ایک قوم دوسری قوم پر ظلم کرے یا اسکے حقوق تلف کرے تو اسلام مظلوم قوم کی حمایت نہ کریگا۔ بلکہ درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ قومیت اور وطنیت کی بنیاد پر دو قوموں میں جو نزاع ہوگی، اسلام اس میں کوئی حصہ نہ لیگا۔ وہ ظالم کو ملامت کریگا، نہ اس لیے کہ وہ فلاں قوم کا آدمی ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ ظالم ہے۔ اور اسی طرح وہ مظلوم کی حمایت بھی اس حیثیت سے نہ کریگا کہ وہ فلاں قوم سے تعلق رکھتا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ مظلوم ہے۔

میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا جہاں ہندوستان کی ایک بہت بڑی ذمہ دار جمعیت کی مقامی شاخ کو منظم کرنے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کی بحث و تمحیص کے بعد جو بات قرار پائی وہ یہ تھی کہ رکنیت کے فارم طبع کرا لیے جائیں اور پندرہ دن کے اندر زیادہ سے زیادہ ممبر بھرتی کر کے ارکان کا ایک جلسۂ عام کر لیا جائے جس میں عہدہ داروں کا انتخاب ہو جائے۔ لیجیے، بس جمعیت کی مقامی شاخ منظم ہو گئی۔ اس طرح بھانت بھانت کے آدمی محض رکنیت کے فارموں پر دستخط کر کے اور رسم رسالانہ فیس ادا کر کے ان جماعتوں میں داخل ہو جاتے ہیں، پھر انہی آدمیوں کے ووٹوں سے منتخب ہو کر وہ لوگ برسر کار آتے ہیں جن کا کام رہنمائی و سربراہ کاری ہوتا ہے، اور ایسے ہی لوگوں کی منفقہ خواہشات سے پالیسیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ کیا کوئی شخص توقع کر سکتا ہے کہ جماعتی تشکیل کے اس طریقے سے کبھی اسلامی نصب العین کی طرف بھی کوئی پیش قدمی کی جا سکتی ہے؟

(۳) اسی طرح تیسرے جز میں بھی ان کا طریقہ اسلام کی راہِ راست سے ہٹا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اسلام براہِ راست غیر اسلامی نظامِ اطاعت پر حملہ کرتا ہے اور اس کا تقاضہ یہ ہے کہ تمام مساعی کو حاکمیتِ رب العالمین کے قیام و اثبات پر مرکوز کر دیا جائے۔ لیکن اس کے برعکس یہ لوگ اپنی سعی و جہد کا رُخ برطانوی نظامِ اطاعت کی تخریب اور حاکمیتِ عوام کے قیام کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ یہ صریح انحراف ہے صراطِ مستقیم سے۔ اس انحراف پر جب اعتراض کیا جاتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ برطانوی نظامِ اطاعت اسلامی نصب العین کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، ہم تنہا اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتے، اس لیے پہلے دوسروں کی مدد سے اس کو دور کر لیں، پھر اصل منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کے لیے راستہ آسان ہو جائیگا۔ مگر میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ راستہ آسان کیسے ہو جائیگا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک نظامِ اطاعت یا دین کو ہٹا کر اُس کی جگہ دوسرا نظامِ اطاعت یا دین کبھی قائم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ نفوسِ انسانی میں پہلے نظام کی تخریب اور دوسرے نظام کی تعمیر کا خیال اور ارادہ کمال درجہ قوت کے ساتھ مستحکم نہ کر دیا جائے۔ اگر ہندوستان کے موجودہ انگریزی نظامِ اطاعت کی جگہ آپ جمہوری نظامِ اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب صرف

اسی طرح ممکن ہے کہ آپ باشندگان ہند کے دلوں میں حاکمیتِ انگریز کے بجائے خود اپنی حاکمیت کے برحق ہونے کا تخیل اور عملاً مالک الملک بن جانے کا عزم پوری شدت کے ساتھ پیدا کردیں۔ برعکس اس کے اگر آپ ہندوستان میں الٰہی نظام اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب بغیر اسکے ممکن نہیں ہے کہ عوام الناس کو خود اپنی حاکمیت کے دعوے سے دست بردار ہونے اور ہر غیر اللہ کی حاکمیت کا انکار کرنے پر آمادہ کریں اور اللہ کے مالک الملک ہونے کا عقیدہ اُنکے دلوں میں اتنی قوت کے ساتھ بٹھائیں کہ وہ اُسکی حاکمیت کے آگے برضا و رغبت سر جھکا دیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا آخری مقصد الٰہی نظام اطاعت کا قیام ہے وہ کس طرح بحالت ہوش و حواس اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے ذریعہ کے طور پر یہ تدبیر اختیار کرسکتے ہیں کہ عوام الناس کے دل میں خود اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور ارادہ اتنی قوت کے ساتھ بٹھا دیں کہ اسکے زور سے دینِ انگریزی کی مضبوط جمی ہوئی جڑیں اکھڑ جائیں اور دینِ جمہور کی جڑیں زمین میں جگہ پکڑ لیں؟ جہاں عامۂ خلائق کے دلوں میں اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور عزم اتنی قوت کے ساتھ جم گیا ہو کیا وہاں لوگوں کو خداوندِ عالم کے آگے اپنی حاکمیت سے دست بردار ہونے پر آمادہ کرنا موجودہ انگریزی حاکمیت کی جڑیں اکھاڑنے سے کچھ کم مشکل ہے؟ کیا امریکہ، جاپان، جرمنی اور انگلستان جیسے اصطلاحاً "آزاد" ممالک میں حکومت الٰہی کا قیام اس سے کچھ کم دشوار ہے جتنا ہندوستان جیسے اصطلاحاً "غلام" ملک میں دشوار نظر آتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی ہی میں دیا جاسکتا ہے، تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ برطانوی اقتدار کی جگہ ہندوستانی اقتدار کا قیام آخر کس معنی میں حکومت الٰہی کے قیام کی طرف ایک گونہ پیش قدمی ہے۔

تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تدبیر عملاً کارگر ہوسکتی ہے تب بھی میں اسکے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہوں ـــــ لازم نہیں کہ ہر تدبیر جو کارگر ہو وہ صحیح بھی ہو ـــــ دراصل یہ ایک سخت ناپاک تدبیر ہے جسے اختیار کرنے کا خیال بھی ایک مسلمان دل میں نہیں لاسکتا۔ جو شخص درحقیقت پوری سچائی کے ساتھ اللہ کے مالک الملک ہونے پر ایمان رکھتا ہو وہ آخر کس دل سے یہ گوارا کرسکتا ہے کہ اپنے ایمان

کے خلاف عوام الناس میں اس عقیدہ کی تبلیغ کرے کہ تم خود مالک الملک ہو؟ جس شخص کا اعتقاد یہ ہو
کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی صرف حدود اللہ کی پابند ہونی چاہیے اور حکومت وہ ہونی چاہیے
جو اللہ کے سامنے جوابدہ ہو وہ کیونکر اپنی کوششوں کا مقصود یہ قرار دے سکتا ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی
پر حدود جمہور کا تسلط قائم ہو اور حکومت جمہور کے سامنے جوابدہ ہو؟ کس طرح ایک سچے آدمی کی زبان ایسے
عقیدے کی اشاعت یا حمایت میں کھل سکتی ہے جسکو وہ فی الواقع باطل سمجھتا ہے، اور کس طرح وہ اُس
چیز کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جہاد کر سکتا ہے جو اس کے اعتقاد میں حق نہیں بلکہ طاغوت ہے؟

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا، یہ تو محض اس امر کا ثبوت ہے کہ ان لوگوں کا راستہ اسلام کی راہِ راست سے
منحرف ہے۔ رہی یہ بات کہ اس پھیر کے راستہ سے یہ لوگ کبھی اسلام کے نصب العین تک نہیں پہنچ
سکتے، تو اس دعوے پر میرے پاس یہ دلیل ہے کہ جن مشکلات سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے یہ پھیر کی راہ
اختیار کی ہے وہ ہندوستان کے انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے بعد بھی جوں کی توں قائم رہینگی۔ اوپر
میں نے مشکلات کی جو تشریح کی ہے اس پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ کیا ان میں سے کوئی مشکل بھی
خود مختار ہندوستان کے دور میں دور ہو جائیگی؟ اگر نہیں تو جو لوگ آج ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی
حکمت اور ہمت نہ رکھنے کی وجہ سے راستہ کترا کر نکل رہے ہیں وہ کل بھی اسی وجہ سے اصل مقصد
اسلامی کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے جی چرائینگے۔ خوب جان لیجیے کہ اس مقصد کی طرف
جب بھی آپ اقدام کرنا چاہینگے، بہر حال آپکو ان مشکلات سے سابقہ پیش آئیگا۔ جو لوگ ان کا مقابلہ
کرنے کی تدبیر اور عزم نہیں رکھتے وہ موجودہ حالات ہی میں نہیں بلکہ کسی حال میں بھی اس طرف اقدام
نہیں کر سکتے۔ اور جنکے پاس تدبیر اور عزم دونوں موجود ہیں، اُن کے لیے کسی پھیر کے راستہ پر چلنا
تضیع وقت اور حماقت ہے، وہ تو اس پہاڑ کو کاٹ کر براہِ راست ہی اپنے مقصد کی طرف
قدم بڑھائینگے۔

پاکستانی خیال کے لوگ | دوسرا گروہ زیادہ تر اُس طبقہ پر مشتمل ہے جس نے تمام تر مغربی طرز پر ذہنی تربیت پائی ہے۔ یہ لوگ سیاسی فکر تو مغربی مآخذ سے لیتے ہیں، مگر چونکہ موروثی طور پر اسلام کے حق میں ایک تعصب ان کے اندر موجود ہے، اور "مسلمان قوم" ہونے کا شعور ان کے اندر بیدار ہو گیا ہے اس لیے جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں "مسلمان قوم" کے لیے اسلام کے نام ہی سے کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اقوال اور اعمال میں اسلامی اصطلاحات اور مغربی طرز فکر و عمل عجیب طریقہ سے خلط ملط ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس مضمون میں یہ موقع نہیں ہے کہ میں اس خلط مبحث کا تجزیہ کر کے تفصیل کے ساتھ اس مخلوطہ کے ایک ایک جز کی اصل و نوعیت کا نشان دے سکوں۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پہلے گروہ کی طرح اس گروہ کا راستہ بھی راہِ راست کے تینوں اجزاء سے منحرف ہے۔

(۱) پہلے دعوت کو لیجیے۔ ان کے ذمہ دار لیڈروں کی تقریریں، ان کی نمائندہ مجلسوں کی قراردادیں، ان کے کارکنوں کی باتیں، ان کے اہلِ قلم کی تحریریں، سب کی سب اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ ان کی دعوت اصل میں ایک قوم پرستانہ دعوت ہے، یعنی ان کی پکار اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں ہے بلکہ اس طرف ہے کہ ان کی قوم متفق و متحد ہو کر ہندو قوم کے مقابلہ میں اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کرے۔ گویا جس طرح آزادی پسند لوگوں نے انگریزوں کو اپنا قومی حریف بنایا ہے اُسی طرح انہوں نے ہندوؤں کو اپنا قومی حریف بنا لیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اور "آزادی پسند" حضرات ایک سطح پر کھڑے ہیں۔ لیکن جس چیز نے اُن کی بہ نسبت ان کی روش کو اسلام کے لیے اور زیادہ مُضر بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تو وطن اور وطنی مفاد کے نام پر لڑتے ہیں، مگر یہ اپنی قومی اور دنیوی لڑائی میں بار بار اسلام اور مسلمان کا نام لیتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام خواہ مخواہ ایک فریقِ جنگ بن کر رہ گیا ہے اور غیر مسلم قومیں اُس کو اپنا سیاسی اور معاشی حریف سمجھنے لگی ہیں۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو اسلام کی دعوت کے لائق نہیں رکھا ہے، بلکہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں اتنی بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے کہ اگر دوسرے مسلمان بھی یہ کام کرنا چاہیں

تو غیر مسلموں کے دلوں کو اسلام کے لیے مقفل پائینگے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قوم پرستانہ دعوت کے ساتھ یہ لوگ کبھی کبھی اسلام کی خوبیاں اور اسکے اصولوں کی فضیلت بھی بیان کیا کرتے ہیں۔ مگر اول تو قوم پرستی کے پس منظر میں یہ چیز ایک اصولی دعوت کے بجائے محض ایک قومی تفاخر بن کر رہ جاتی ہے۔ اور مزید براں دعوت اسلام کے ساتھ جن دوسری باتوں کی یہ آمیزش کرتے ہیں وہ بالکل اس دعوت کی ضد ہیں۔ ایک طرف اسلامی نظام حکومت کی تبلیغ اور دوسری طرف اُن "مسلمان" ریاستوں اور حکومتوں کی حمایت جنکا نظام بالکل غیر اسلامی ہے، ایک طرف اسلامی نظام معاشی کی تشریح اور دوسری طرف خود اپنی قوم کے قارونوں کی تائید و مدافعت، ایک طرف انسانی قانون سازی کا اصولی ابطال اور دوسری طرف خود قانون ساز مجلسوں میں اپنے حصہ کا مطالبہ، ایک طرف حاکمیت رب العالمین کا اقرار و اثبات اور دوسری طرف حاکمیت جمہور کے اصول پر خود اپنی قومی حکومت کے قیام کی فکر، ایک طرف انسانیت کی نسلی، قومی اور وطنی تقسیم کا ابطال اور دوسری طرف ہر وقت قوم قوم کا شور، اور خود قومیت ہی کے اصول پر دوسری قوموں سے جدال و کشمکش، ایک طرف بے غرضانہ حق پرستی کا دعویٰ اور دوسری طرف شب و روز اپنے دنیوی مفاد ہی کا نوحہ و ماتم، ایک طرف اسلامی تہذیب و تمدن پر فخر و ناز اور اسکی حفاظت کے لیے پُر شور لام بندی اور دوسری طرف اسی تہذیب و تمدن کے باغیوں اور قاتلوں کی سرداری و پیشوائی، یہ دونوں چیزیں آخر کس طرح ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں؟ منکرے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن۔ ایسی متضاد باتوں سے دنیا نے کب کوئی اثر قبول کیا ہے کہ آج ان سے اسلام کا جھنڈا زمین میں گڑ جانے کی امید کی جاتی ہے۔

(۲) اب دیکھیے کہ یہ اپنی جماعتی تشکیل کس ڈھنگ پر کرتے ہیں۔ انکا قاعدہ یہ ہے کہ یہ اُن سب لوگوں کو جو از روئے پیدائش مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اپنی جماعت کی رکنیت کا بلاوا دیتے ہیں اور جو اُس کو قبول کرلے اسے ابتدائی رکن بنا لیتے ہیں۔ پھر انہی ابتدائی ارکان کے ووٹوں سے ذمہ دار

کارکن اور عہدہ دار منتخب ہوتے ہیں اور انہی کی کثرت رائے سے تمام معاملات انجام دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ صرف قومی تنظیم ہی کے لیے موزوں ہو سکتا ہے اور اس طریقہ سے جو نظام بنے وہ اسکے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ ایک قوم کی خواہشات جیسی کچھ بھی ہوں اُنکے حصول کی کوشش کرے۔ رہی ایک اصولی تحریک، تو اسکو چلانے کے لیے یہ طریق جماعت سازی نہ صرف بیکار بلکہ مُضر ہے۔ ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ اُنکے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ انبوہِ عظیم جسکو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اسکے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویّہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اسلیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ اُنکی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستہ پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(۳) اسکے بعد اُس طریقہ کا جائزہ لیجیے جس سے یہ بزعم خود اسلامی نصب العین تک پہنچنے کی امید رکھتے ہیں۔ اُنکی تجویز یہ ہے کہ پہلے اُسی جمہوری دستور کے مطابق، جو انگریزی حکومت یہاں نافذ کرنا چاہتی ہے، مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے، پھر کوشش کی جائیگی کہ یہ قومی حکومت اسلامی نظامِ حکومت میں بتدریج تبدیل ہو جائے[۱]۔ لیکن یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسی

[۱] اس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اسکے اُنکی طرف سے بصراحت اور بتکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اُنکے پیش نظر محض ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ ہو)

"آزادی ہند" کو مقدم رکھنے والے حضرات کر رہے ہیں۔ اُنکی تجویز پر مجھے جو اعتراضات ہیں بعینہٖ وہی اعتراضات اُنکی تجویز پر بھی ہیں۔ اِنکا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حاکمیتِ جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیت ربّ العالمین کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے۔ جیسی مسلم اکثریت اِس مجوزہ پاکستان میں ہے، ویسی ہی، بلکہ عددی حیثیت سے بہت زیادہ زبردست اکثریت افغانستان، ایران، عراق، ٹرکی اور مصر میں موجود ہے اور وہاں اُسکو وہ "پاکستان" حاصل ہے جسکا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ پھر کیا وہاں مسلمانوں کی خود مختار حکومت کسی درجہ میں بھی حکومت الٰہی کے قیام میں مددگار ہے یا ہوتی نظر آتی ہے؟ مددگار ہونا تو درکنار، میں پوچھتا ہوں کیا آپ وہاں حکومت الٰہی کی تبلیغ کر کے پھانسی یا جلاوطنی سے کم کوئی سزا پانے کی امید کر سکتے ہیں؟ اگر آپ وہاں کے حالات سے کچھ بھی واقف ہیں تو آپ اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کر سکینگے۔ اور جب صورت حال یہ ہے تو آپکو غور کرنا چاہیے کہ آخر اسلامی انقلاب کے راستہ میں مسلمان قوموں کی یہ آزاد حکومتوں کے سدِّ راہ ہونے کا سبب کیا ہے۔ اس معاملہ کی جتنی تحقیق آپ کرینگے جواب اِسکے سوا کچھ نہ پائینگے کہ دراصل اصطلاحاً و نسلاً مسلمان ہونا اور چیز ہے اور نظریۂ حیات و مقصدِ زندگی کا اسلامی ہونا بالکل ایک دوسری چیز۔ جو لوگ

بقیہ حاشیہ صت ۲ ۔ غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔ بالفاظ دیگر انکو مطمئن کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبے آزاد ہو جائیں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے، باقی رہا نظامِ حکومت تو وہ "پاکستان" میں بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ہندوستان میں ہوگا۔ ان کے اس نصب العین پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابل ترجیح نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت ہے، تو ذمہ دار لیڈروں میں سے تو کسی نے اس کا جواب نہ دیا، البتہ جو لوگ پاکستانی حلقوں کی صفِ آخر میں شمار ہوتے ہیں اور جنکی کوئی ذمہ دارانہ حیثیت نہیں ہے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلم اکثریت کو جب خود اختیاری حاصل ہو جائیگی تب ہم نظامِ حکومت کو بدلنے کی کوشش کرینگے۔

روح و اخلاق کے اعتبار مسلم نہ ہوں، بلکہ محض اصطلاحی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہوں اُنکو اگر بیرونی اثر و اقتدار سے کامل آزادی نصیب بھی ہو جائے، اور اگر اُنکے جمہور کو خود اپنی پسند کے مطابق نظام حکومت قائم کرنے کا پورا اختیار بھی حاصل ہو، تب بھی حکومتِ الٰہی وجود میں نہیں آسکتی۔ وہ اپنے دنیوی مفاد کے پرستار ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان میں حق اور صداقت کے لیے اپنے مفاد کو قربان کرنے کی طاقت نہیں ہوتی، بلکہ اسکے برعکس جب کبھی اُنکی اغراض دنیوی سے حق و صداقت کا تصادم ہوتا ہے تو وہ حق کو چھوڑ کر ہمیشہ اُس طرف جاتے ہیں جدھر اُنکی اغراض پوری ہوتی ہیں۔ جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ عام انتخاب میں اُنکے ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہونگے جو منہاج نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں۔ جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا، قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح اگر سوسائٹی بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسر اقتدار آئینگے جو اس سوسائٹی کی خواہشات نفس سے سندِ قبولیت حاصل کر سکینگے۔ پس جو لوگ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائیگی، اُن کا گمان غلط ہے۔ دراصل اسکے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت کر کے، اُنکے نقطۂ نظر کو تبدیل کر کے، اور اُنکے نفسیات میں انقلاب برپا کر کے ایک جمہوری نظام کو الٰہی حکومت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی و نفسیاتی انقلاب کے برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ہوگی؟ کیا وہ لوگ جو موجودہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے مادّی مفاد سے اپیل کر کے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہونگے ان سے آپ امید کر سکتے ہیں کہ وہ حکومت کا روپیہ، اسکے وسائل، اُسکے اختیارات کسی ایسی تحریک کی اعانت میں صرف کرینگے جسکا مقصد عوام کی ذہنیت تبدیل کرنا اور انہیں حکومت

الٰہی کے لیے تیار کرنا ہو؟ اس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ لوگ اس انقلاب میں مدد دینے کے بجائے الٹی اسکی مزاحمت کرینگے کیونکہ وہ خوب جانتے ہونگے کہ اگر عوام کی نفسیات میں تغیر واقع ہوگیا تو اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں انکا چراغ نہ جل سکے گا۔ یہی نہیں، اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی بہ نسبت بہت زیادہ جسارت و بے باکی کے ساتھ ایسی ہر کوشش کو کچلیں گے اور اُنکے نام اُنکے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہونگے۔ جب صورتِ معاملہ یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش کرے جو ہر کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اُسکے مقصد کی راہ میں حائل ہوگی؟

تحریفِ دین کے مجوزین | اب تیسرے گروہ کو لیجیے۔ یہ لوگ مختلف قسم کی تجویزیں سوچ رہے ہیں۔ کوئی فکر اسلامی کے ساتھ غیر اسلامی افکار کا جوڑ لگا کر ایک نئی "خوشگوار" معجون بنانا چاہتا ہے۔ کوئی اس خیال میں ہے کہ "ہندوستانی اسلام" کا ایک نیا ایڈیشن نکالے۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اسکے سیاسی و معاشی اصولوں کو لے لیا جائے اور انکی بنیاد پر ایک ایسی جماعت بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے عقائد، عبادات اور احکام شرعیہ کی پابندی لازم نہ ہو۔ یہ سب لوگ اپنے نزدیک نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان طریقوں سے رفتہ رفتہ وہ تنفر دور ہو جائیگا جو اسلام کے خلاف طبیعتوں میں پیدا ہوگیا ہے، اور جب لوگ بعضِ اسلام سے کسی حد تک مانوس ہو جائینگے تو پورے اسلام سے مانوس ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔

لیکن یہ سب خیالاتِ خام ہیں۔ نہ اصولی حیثیت سے اِنکو صحیح کہا جاسکتا ہے اور نہ عملی حیثیت سے ہی ان کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ میرے نزدیک ایسی تمام تجویزیں ضعفِ دل اور ضعفِ دماغ کا نتیجہ ہیں۔

اصولی حیثیت سے درحقیقت ہم اسلام میں کسی رد و بدل، کسی کمی و بیشی، اور کسی ترمیم و تشکیلِ جدید کے

مجاز ہی نہیں ہیں۔ ہم اسلام کے مالک نہیں ہیں، اُسکے صانع نہیں ہیں، اُسکے شارع نہیں ہیں۔ اسلام ہمارا مال نہیں ہے کہ مارکیٹ میں جیسی طلب ہو اسکے مطابق اپنے اس مال کو بنا کر بازار میں لائیں۔ ہماری حیثیت صرف پیرو اور مبلّغ کی ہے۔ مالک نے عقائد، عبادات اور احکام کا یہ پورا مجموعہ ہمیں دیا ہے تاکہ ہم خود اسکی پیروی کریں اور دوسروں تک اسے پہنچائیں۔ اس مجموعہ میں کوئی ترمیم کرنے کا، یا اسکی اصلی صورت کو بدل کر اسکی کوئی اور صورت بنانے کا ہم کو ہرگز کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جسکو لینا ہے اسے پورے مجموعہ کو لینا پڑیگا اور اسی صورت میں لینا ہوگا جس میں مالک نے اُسے دیا ہے۔ اور جو اسکو اس ہیئت مجموعی اور اس مقرر صورت کے ساتھ نہ لینا چاہے اسکی خوشامد کرنے اور اسے کم و بیش پر راضی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اسلام تو ایک حکم ہے خالق کی طرف سے مخلوق کی طرف۔ خالق کا کام مخلوق کی خوشامد کرنا اور اسکو راضی کرنا نہیں ہے۔ مخلوق کو یا تو اس کا حکم، جیسا کہ وہ ہے، جوں کا توں ماننا پڑیگا۔ ورنہ وہ خود اپنا ہی کچھ بگاڑیگی، خالق کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی۔ اسی لیے اللہ کی طرف سے اسکے جو رسول دنیا میں آئے انہوں نے پورے حکم کو لوگوں کے سامنے بعینہٖ پیش کردیا اور صاف کہہ دیا کہ جا ہو اسکو لو اور جا ہو رد کردو، بہر حال تمہاری خواہشات کے مطابق اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جائیگا۔ ٹھیک یہی پوزیشن رسولوں کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہماری بھی ہے۔

پھر یہ کتنی غیر معقول تجویز ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اسکے معاشی و سیاسی اصولوں کو لے لیا جائے اور انہی کی بنیاد پر ایک پارٹی ایسی بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے توحید، آخرت، قرآن، رسالت کسی چیز پر بھی ایمان لانے کی ضرورت نہ ہو اور نہ عبادات کی بجا آوری اور احکام شرعیہ کی پابندی ضروری ہو۔ کیا کوئی صاحب نظر آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال کرسکتا ہے کہ کسی اجتماعی نظریہ اور لائحہ عمل کو اُسکے بنیادی فلسفے، اُسکے نظام اخلاق اور اسکے تعمیر سیرت کرنے والے ارکان سے الگ کرکے چلایا جاسکتا ہے۔ اللہ کی حاکمیت کا تصور نکال دینے کے بعد اسلام کا نظام سیاسی آخر ہے کس چیز کا

نام؟ اور اگر قرآن کو ماخذِ قانون اور محمدؐ رسول اللہ کو رعیت (انسان) اور بادشاہ (اللہ) کے درمیان تنزیلِ احکام کا واحد مستند ذریعہ نہ مانا جائے تو کیا اسلامی طرز کے اسٹیٹ کی تعمیر ہوا پر کی جائیگی؟ نیز وہ کونسا نظامِ تمدن و سیاست ہے جو کسی نظامِ اخلاق کا سہارا لیے بغیر قائم ہو سکتا ہو؟ اور کیا اللہ کے سامنے انسان کی ذمہ داری و جوابدہی کا تخیل نکال دینے کے بعد اُس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے کوئی اخلاقی سہارا باقی رہ جاتا ہے جس کا نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے؟ کیا اس نظام کو آپ مادّہ پرستانہ اخلاقیات کے بل پر ایک دن کے لیے بھی قائم کر سکتے ہیں؟ مزید برآں وہ خاص قسم کی انفرادی سیرت اور جماعتی زندگی جو اس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے درکار ہے، نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ کے سوا اور کس ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور وہ نہ ہو تو یہ نظام چل کہاں سکتا ہے؟ پس یہ غایت درجہ کا افلاسِ فکر ہے کہ کوئی شخص محض شاخوں کا حُسن دیکھ کر کہنے لگے کہ آؤ جڑ کے بغیر ان شاخوں ہی سے درخت قائم کریں۔

عملی حیثیت سے بھی اس قسم کی تمام تجویزیں سراسر غلط ہیں۔ ان سے اصل مقصد تک پہنچنے کے بجائے خطرہ یہ ہے کہ کہیں ہم خود ہی راستہ میں گم نہ ہو جائیں۔ ترمیم شدہ صورت میں جس نام نہاد اسلام کی تبلیغ کی جائیگی، ایک روز وہی اصلی معیار بن جائیگا، اور جو لوگ اس پر ایمان لا کر جماعت میں شریک ہونگے، نہ صرف وہ خود اصل اسلام کی طرف رجوع کرنے سے انکار کرینگے بلکہ وہ مصلحت پرست مسلمان بھی، جنہوں نے اُن سے کم و بیش پر سودا کیا تھا، انکے ساتھ انکی گمراہی میں شریک ہو جائینگے۔ مدارات (Compromise) پر جو کام مبنی ہوتے ہیں ان میں ہمیشہ یہی خرابی ہوتی ہے۔

۶۔ مشکلات کا جائزہ

اب ہمیں ایک نظر ان مشکلات پر ڈالنی چاہیے جن سے خوف زدہ ہو کر یہ انحراف کی راہیں اختیار کی جارہی ہیں۔ کیا حقیقت میں وہ ایسی ہی مشکلات ہیں کہ ان کو حل نہیں کیا جاسکتا؟

تکرارِ بیان سے بچنے کے لیے میں ناظرین کو پھر ایک مرتبہ تکلیف دونگا کہ پیچھے پلٹ کر مضمون کے اس حصہ پر نگاہ ڈال لیں جہاں میں نے ان مشکلات کی تشریح کی ہے۔

پہلی مشکل | پہلی مشکل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام صرف تمدنی، سیاسی اور معاشی مسائل کا حل ہی پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد، عبادات اور ضوابط شرعیہ کا ایک مجموعہ بھی اُسکے ساتھ دیتا ہے، اور اسکو قبول کرنے کے معنی انسان کی پوری زندگی کے تبدیل ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز اسلام کو اس طرح پھیلنے نہیں دیتی جسطرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں۔ لیکن یہ مشکل بظاہر جتنی زبردست نظر آتی ہے، بباطن اتنی ہی کمزور اور بے حقیقت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اجتماعی نظریہ اور مسلک بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی زندگی کے عملی مسائل کا مجرد حل پیش کرتا ہو اور اسکے ساتھ اپنے کچھ اعتقادات اور اپنا ایک مخصوص فلسفہ نہ رکھتا ہو۔ چند امور مابعد الطبیعہ Metaphysical problems ایسے ہیں جنکے متعلق سلبی یا ایجابی حیثیت سے ایک نہ ایک رائے قائم کرنا بہرحال ہر اس مسلک کے لیے ناگزیر ہے جو انسان کے لیے ایک لائحۂ زندگی بنانے کا عزم کرے۔ یہ سوالات کہ کائنات کا یہ نظام کس نوعیت کا ہے؟ اور اس نظام میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اور انسان کی زندگی کا مآل کیا ہے؟ اور یہ کہ دنیا میں سب کچھ تو انسان کے لیے ہے مگر انسان خود کس کے لیے ہے؟ یہ دراصل زندگی کے بنیادی سوالات ہیں جنکا ایک قابلِ عمل حل Workable solution پیش کیے بغیر کوئی ذہنی، اخلاقی، تعلیمی اور تمدنی نظام بنایا ہی نہیں جا سکتا اور کسی نظام کے بھی محض عملی پہلوؤں کو لے کر آدمی کام نہیں کر سکتا جب تک کہ ساتھ ساتھ اس کے بنیادی فلسفہ، یا بالفاظ دیگر اسکے اعتقادات کو بھی قبول نہ کرے۔ پس ایک اعتقادی نظام ہونا تنہا اسلام ہی کی کوئی انوکھی خصوصیت نہیں ہے۔ اس بہت سے اگر اسلام کی راہ میں کوئی مشکل حائل ہے تو ایسی مشکل ہر اجتماعی مسلک کی راہ میں حائل ہے۔ ہر اجتماعی مسلک فی الواقع ایک مذہب ہی

اور جو بھی اسکی پیروی اختیار کرتا ہے وہ حقیقت میں ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے خواہ اپنی سادہ لوحی کی بنا پر یہ کہتا اور سمجھتا رہے کہ بدستور اپنے پہلے مذہب پر ہوں۔

میں ایک سیدھی سی مثال سے اس نکتہ کی مزید توضیح کرونگا۔ یہ کمیونزم آپکے سامنے ہے اسی کو مثال میں لے لیجیے۔ اگر اسلام اس مابعد الطبیعی نظریہ سے اپنے مسلک کی ابتدا کرتا ہے کہ خدا ہے تو کمیونزم اس نظریہ سے چلتا ہے کہ خدا نہیں ہے یا کم از کم یہ کہ اس کا وجود و عدم وجود ہمارے لیے خارج از بحث ہے۔ اگر اسلام یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا خدا کی سلطنت ہے اور انسان یہاں اُس کا تابع امر ہے تو کمیونزم یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی بساط ہے اور انسان یہاں مطلقاً خود مختار (Independent) ہے۔ اگر اسلام یہ پہلو لیتا ہے کہ انسان کو یہاں کام کرنے کے لیے خدا کی ہدایت درکار ہے اور وہ وحی کے ذریعہ سے آتی ہے تو کمیونزم یہ پہلو لیتا ہے کہ کوئی ہدایت درکار نہیں ہے اور وحی نہیں آتی۔ اگر اسلام اس مقام سے سلوک کا آغاز کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں انسان کو اپنی موجودہ زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دینا ہے تو کمیونزم اس مقام سے چلتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی زندگی ہے اور بعد میں نہ زندگی ہے نہ حساب کتاب۔ دیکھیے، یہ دونوں یکساں مابعد الطبیعی نظریے ہیں اور دونوں میں سے کسی کو بھی تجربہ یا مشاہدہ سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اب اگر کسی سائنٹفک ثبوت کے بغیر محض استدلال اور قلبی شہادت کی بنا پر بہت سے وہ لوگ جو کل تک کمیونسٹ نہ تھے، آج کمیونزم کے نقطۂ نظر کو قبول کرسکتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ آخر انہی دو بنیادوں پر بہت سے وہ لوگ جو آج مسلم نہیں ہیں، کل اسلام کا نقطۂ نظر کیوں قبول نہیں کرسکتے؟

اسی طرح ایک ہادی پر ایمان لانے کا معاملہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اگر مسلم ہونے کے لیے محمد رسول اللہ پر ایمان لانا پڑتا ہے تو کمیونسٹ بھی آخر مارکس پر ایمان لاتا ہی ہے۔ پھر اگر ایک شخص جو کل تک مارکسی نہ تھا آج مارکس کی تعلیمات کو دیکھ کر اسکو اپنا رہنما تسلیم کرسکتا ہے، تو آخر کونسی چیز مانع ہے کہ

ایک وہ شخص جو کل تک مسلم نہ تھا، آج محمد رسول اللہ کی زندگی، انکی تعلیمات اور ان کے کارنامے کو دیکھ کر ان کو اپنا ہادی اور رہبر نہ تسلیم کرلے؟

ایسا ہی معاملہ جماعتی ضوابط (Party-discipline) کا بھی ہے۔ اگر اسلام اُن لوگوں کو جو اسکی جماعت میں شامل ہوں، اپنے کچھ ضوابط کا پابند بناتا ہے تو کیا کمیونسٹ پارٹی اُن لوگوں کو جو اس میں شامل ہوں کسی ضابطہ اور کسی قاعدے میں نہیں جکڑتی؟ پھر جب بہت سے انسان کمیونزم کے اصولوں پر ایمان لانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ضوابط کی پابندی قبول کر لیتے ہیں تو آخر اسلام ہی کے جماعتی ضوابط میں کونسا ہَوّا چھپا ہوا ہے کہ جو لوگ اسلام کے اصولوں کو جانچ کر ان پر ایمان لانے کے لیے تیار ہونگے انکو یہ ہَوّا اپنی صورت دکھا کر بھگا دیگا؟

اس مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں خدا کی ہستی اور اسکی توحید کا اعتقاد، یا آخرت کا اعتقاد، یا پیغمبر کی ناقابل منازعت پیشوائی Indisputable leadership اور قرآن کے آخری منبع قانون ہونے کا اعتقاد شرط لازم ہونا، اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ضوابط کی پابندی فرض ہونا، ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسکے پھیلنے اور غیر مسلموں کے اسکی طرف کھنچ کر آنے میں سدِّ راہ ہو۔ مابعد الطبیعی اعتقادات اور جماعتی ضوابط دوسرے مسلکوں میں بھی موجود ہیں، اور جو انسان ان مسلکوں میں اپنی زندگی کے مسائل کا حل اپنی سمجھ کے مطابق صحیح پاتے ہیں وہ ان کے عقائد اور ضوابط، دونوں کو قبول کرتے ہی ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں اگر اسلام انکے سامنے تمام مسائل زندگی کا بہترین حل پیش کرے، اور انکی اپنی فلاح و سعادت کا راستہ کھول کر سامنے رکھ دے تو عقائد اور ضوابط کی شرط صرف اسلام ہی کے معاملہ میں آکر ایسے غیر معمولی رکاوٹ ثابت ہو۔ رکاوٹ اگر ہے تو فی الواقع صرف اسی حد تک ہے کہ لوگوں کے لیے بالعموم اپنے پرانے مسلک کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مسلک اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جو تحریک بھی دنیا میں پھیلتی ہے اسے بہرحال اس رکاوٹ سے سابقہ پیش آتا ہی ہے اور جو لوگ کسی تحریک پر ایمان لاتے ہیں ا

بہرحال اس رکاوٹ کو عبور کر کے ہی قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ اس کو سامنے کھڑا دیکھ کر راستہ کترانے کی کوشش صرف وہی شخص کریگا جو یا تو اپنے ایمان ہی میں صادق نہیں ہے یا پست ہمت اور ناکارہ انسان ہے۔

البتہ اسلام کے حق میں اس رکاوٹ کو جس چیز نے شدید تر رکاوٹ بنا دیا ہے وہ ہماری یہ جامد اور بے روح مذہبیت ہے جسے آج کل اسلام سمجھا جا رہا ہے۔

اس بے روح مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد اور عبادات کا کوئی ربط اجتماعی نظام اور کاروبار حیات دنیا سے قائم نہیں رہا ہے۔ اسلام کے عقائد محض ایک دھرم Religion کے مزعومات (Dogmas) بنا کر رکھ دیے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفۂ اجتماع اور نظام تمدن کی منطقی بنیاد ہیں۔ اور اسی طرح اسکی عبادات محض پوجا اور تپسیا بنا کر رکھ دی گئی ہیں حالانکہ وہ اُن ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظام اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عملِ تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدنی لائحہ عمل کو چلانے کے لیے ان عقائد اور عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے۔

دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جسکی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گذشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثار قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہار قدر شناسی تو کر سکتے ہیں، مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اُس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کرینگے۔

تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر منصوص تعیُّن، اور روح سے بڑھ کر مظاہر پر مدارِ دین داری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے، اور وہ غیروں کی تالیف تو کیا

کرتی کی اُلٹی اپنوں کی تنفیر کا سبب بن رہی ہے - اس غلط مذہبیت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور اُن کی باتیں سن کر آدمی اس سوچ میں پڑجاتا ہے کہ انسان کی ابدی فلاح و خسران کا مدار کیا انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دیتے ہیں ؟

اسلام کے راستہ میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے مگر یہ اسلام کا قصور نہیں، ہمارا اپنا قصور ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے اُس نظام تعلیم کو بدلیں جس نے دین کے تصور کو اتنا غلط اور شریعت کے علم کو اس قدر جامد بنا دیا ہے - ظاہر ہے کہ ایک زندہ تحریک محض عقائد کے بل پر تو نہیں اُٹھ سکتی - ہمیں اسکے عقائد کو معقول دلائل کے ساتھ پیش کرنا ہوگا، پھر عقائد کے ساتھ عبادات کا اور عبادات کے ساتھ قوانینِ زندگی کا منطقی ربط واضح کرنا پڑیگا، پھر ان قوانین کو زندگی کے تمام عملی مسائل پر منطبق کر کے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ جتنی انسانی ضروریات ہیں اُن سب کا حل ان قوانین میں موجود ہے، تب کہیں لوگ اس نظام کو ایک معقول نظام کی حیثیت سے سمجھ سکینگے، اور جب وہ اسے سمجھینگے تو قبول بھی کرنے پر آمادہ ہونگے - یہ تعمیری کام چونکہ سخت محنت طلب ہے، اسلیے اس محنت سے جی چرا کر لوگ بنے بنائے آسان راستوں کی طرف دوڑ جاتے ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے راستہ بنانے کی زحمت بہرحال ہمیں اٹھانی ہی پڑیگی - جس نے بھی کوئی مقصدِ عظیم پیشِ نظر رکھا ہے اسے یہ زحمت اٹھانی پڑی ہے، اور اگر واقعی ہم اپنے مقصد میں صادق ہیں تو ہمیں اس کام کے لیے تیار ہونا چاہیے -

دوسری مشکل | اب دوسری مشکل کو لیجیے - جن تعصبات کو اسلام کی راہ میں حائل بتایا جاتا ہے ان کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

ایک قسم کا تعصب تو وہ ہے جو طبعاً ہر شخص کے اندر ہر اُس چیز کے خلاف ہوتا ہے جو اُس کے لیے نئی ہو، جس پر اس نے اپنے باپ دادا کو نہ پایا ہو، اور جس سے وہ مانوس نہ ہو - یہ تعصب صرف آج ہی اسلام کی راہ میں حائل نہیں ہے، پہلے بھی حائل تھا - اور جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، صرف اسلام ہی کی راہ

ں حائل نہیں ہے، ہر تحریک کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایسی رکاوٹ نہیں ہے جسکو دور نہ کیا جا سکتا ہو۔ پہلے بھی اس رکاوٹ کے باوجود اسلام پھیلا ہے اور اب بھی پھیل سکتا ہے۔

دوسری قسم کا تعصب وہ ہے جو دراصل اسلام کے خلاف نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف پیدا ہوا ہے اور مسلمانوں کے واسطے سے اسلام کی راہ میں حائل ہو گیا ہے۔ مسلمانوں نے پچھلی کئی صدیوں میں جو غیر اسلامی طریقے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اختیار کیے، اور اب بھی اپنے انفرادی کردار اور اجتماعی رویے میں جس غیر اسلامی سیرت کا وہ اظہار کر رہے ہیں، یہ سارے تعصبات فی الحقیقت اسی کے بھڑکائے ہوئے ہیں۔

اس واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان کو اصلی اسلامی حکومت، خالص اسلامی اخلاق اور حقیقی اسلامی تمدن سے لذت آشنا ہونے کا کبھی موقع ملا ہی نہیں۔ گذشتہ زمانہ میں مسلمان بادشاہوں نے، مسلمان امراء نے، مسلمان حکام اور اہل کاروں اور سپاہیوں نے، مسلمان زمینداروں اور رئیسوں نے اور مسلمان عوام نے اپنے برتاؤ سے اسلام کا جو نمونہ پیش کیا وہ ہرگز ایسا نہ تھا کہ اس ملک کے عام باشندوں کو اسلام کا گرویدہ بنا سکتا۔ بلکہ اسکے برعکس نفسانی اغراض کے لیے جو کشمکش انکے اور غیر مسلم عناصر کے درمیان مدتہائے دراز تک برپا ہوتی رہی اُس نے اسلام کے خلاف مستقل تاریخی تعصبات پیدا کر دیے۔

اس تاریخی پس منظر کے ساتھ اسلام کا جو نمونہ آج اس زمانہ میں مسلمان اپنی انفرادی زندگی اور اجتماعی طریقِ کار سے پیش کر رہے ہیں وہ بھی کچھ ایسا خوبصورت نہیں ہے کہ اس قسم کے نمونے کو دیکھ کر لوگ اُس تحریک کے عاشق ہو جائیں جسکی نمائندگی اس شان سے کی جا رہی ہو۔ انفرادی زندگی میں ایک عام مسلمان ایک عام غیر مسلم سے آخر کس چیز میں برتر نظر آتا ہے کہ لوگ اُس برتری کے منبع کی جستجو کریں؟ اس کے برتاؤ میں، اسکے اخلاق میں، اسکے معاملات میں کہاں کوئی خفیف سی چمک بھی ایسی نمودار ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ شخص فائق تر اور پاکیزہ تر اصولوں کا پیرو ہے؟ کیا ایک مسلمان زمیندار یا "شریف" اصطلاحی "کمینوں" کے مقابلہ میں اپنے طبقہ کے کسی غیر مسلم "شریف" یا رئیس سے کچھ کم نخوت برتتا ہے؟

کیا ایک مسلمان تاجر یا پیشہ ور آدمی اپنے ہم پیشہ غیر مسلم سے کچھ زیادہ متدین ہوتا ہے؟ کیا ایک مسلمان حاکم یا عہدہ دار اپنے اختیارات کے استعمال میں کسی غیر مسلم ہمسر سے کچھ بہتر اخلاقی اصولوں کی پیروی کرتا ہے؟ کیا دفتروں کے مسلمان ملازم رات دن انہی تمام ذلیل طریقوں کی پیروی نہیں کر رہے ہیں جنکی پیروی انکے غیر مسلم ساتھی کرتے ہیں؟ کیا وہی جائز و ناجائز طریقوں سے اپنی قوم کا تعصب، وہی کمینہ چالوں سے غیر قوم والوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرنا، اور انہی چھوٹی چھوٹی دنیوی اغراض کے پیچھے لڑنے مرنا جسکی شکایت یہ غیر مسلموں سے کرتے ہیں، خود ان کا بھی رات دن کا مشغلہ نہیں ہے؟ پھر جب ایک غیر مسلم اسلام کے ان نمائندوں کی زندگی میں کہیں بھی کوئی فوقیت کا نشان نہیں پاتا، جب وہ انہیں بھی وہی سب کچھ کرتے دیکھتا ہے جو وہ خود کرتا ہے، اور جب وہ انہیں بھی انہی مقاصد کے لیے لڑتے جھگڑتے، اور کشمکش کرتے دیکھتا ہے جنکے لیے وہ خود لڑتا جھگڑتا اور کشمکش کرتا ہے، تو آخر کونسی چیز اسکو اُس مسلک کی طرف مائل کر سکتی ہے جسکی نمائندگی یہ لوگ کر رہے ہیں۔ بلکہ جب ایک ہی نفسانیت اور دنیا پرستی کے میدان میں وہ اور یہ برابر کے حریف ہیں تو اپنے حریفوں کے مسلک پر وہ کھلے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس کرنے لگا؟ ایک طرف پچھلے تاریخی تعصبات، اور پھر آج کی نفسانی کشمکش، کیا یہ دونوں چیزیں اسکے دل کے دروازوں پر قفل چڑھانے کے لیے کافی نہیں؟

انفرادی زندگی سے وسیع تر قومی دائرے میں مسلمان اس وقت تک جس پالیسی پر چلتے رہے ہیں، اور آج جس پالیسی پر مُصر ہیں، بلکہ جسے اپنی حیاتِ اجتماعی کا ضامن سمجھ رہے ہیں وہ کیا ہے؟ اصولِ اسلام اور مقاصدِ اسلام کا کہیں نام تک نہیں آتا۔ کسی خطبے، کسی تقریر، کسی ریزولیوشن میں آپ ایک فقرہ ایسا نہیں پا سکتے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہ لوگ اپنی اغراض اور اپنے دنیوی مقاصد کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کی فلاح کے لیے عالمگیر کلّی اصول لیکر اُٹھے ہیں اور انکی لڑائی محض اصولِ حق کی خاطر ہے۔ اسکے برعکس آپ یہ دیکھینگے کہ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان بالکل برابر کی

قوم پرستانہ جنگ برپا ہے، دونوں ایک سطح پر اتر آئے ہیں، ایک ہی مرتبہ کی دنیوی اغراض کے لیے کشمکش کر رہے ہیں، ایک ہی قسم کی چالیں (Tactics)، زبان، اصطلاحات اور اصول نزاع اختیار کر رہے ہیں، اور سارا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا انہی چیزوں کے لیے ہے جنکے لیے انکے حریفوں کا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا ہے۔ پھر کس طرح یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جن لوگوں سے آپ دنیوی اغراض کے لیے مساوی مرتبہ پر لڑ رہے ہوں، جن سے آپ رقابت اور حریفی کا پرانا اور تازہ رشتہ رکھتے ہوں، جنکے ساتھ آپ کی سیاسی اور معاشی مفادات کے لیے کشمکش برپا ہو، وہ آپ کی طرف سے کسی اصولی تحریک کی دعوت پر اسی طرح کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہونگے جس طرح وہ اشتراکیت یا ڈیمو کریسی یا کسی اور مسلک کی دعوت کے لیے تیار رہتے ہیں؟

یہ تعصبات اسلام کے راستہ میں دوسری عظیم الشان رکاوٹ ہیں، مگر ان کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم ان تعصبات کی پیدائش کے سبب کو باقی رکھیں اور پھر انکی موجودگی کو بہانہ بنا کر اپنے مقصد کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے منہ موڑیں، بلکہ انکا اصلی علاج یہ ہے کہ ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی طرزِ عمل کو بدلیں اور اس طرح تمام تعصبات کی جڑ کاٹ کر اپنے مقصد کی طرف بڑھنے کے لیے سیدھا راستہ تیار کریں۔ جو لوگ محض سرسری نگاہ میں یہ دیکھ کر کہ اسلام کے خلاف ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، تمام قوموں میں سخت تعصبات پھیلے ہوئے ہیں، یہ فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ اس حالت میں اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں پھیل سکتا، وہ دراصل واقعات کو غلط رنگ میں دیکھتے اور غلط نتائج نکال لیتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر ثابت کیا ہے، یہ تعصبات اسلام اور اسلامی سیرت کے بھڑکائے ہوئے نہیں ہیں (جس سے ان قوموں کو ہندوستان میں کم ہی سابقہ پیش آیا ہے) بلکہ اسلام کے ان غلط نمائندوں کی روش سے پیدا ہوئے ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود غیر اسلامی طریقوں پر چلتے رہے اور خالصتہً للہ کام کرنے کے بجائے اپنی دنیوی اغراض اور نفسانی خواہشات کے لیے کام کرتے رہے۔ لہٰذا ان تعصبات کے تدارک کی صحیح صورت یہ ہے کہ

اب اپنی سیرت، اپنے اعمال اور اپنی اجتماعی جد و جہد سے اسلام کی صحیح نمائندگی کیجیے، نہ یہ کہ تعصبات کی موجودگی کو اُسی غلط روش پر چلنے کے لیے حجت بنائیے جس کی وجہ سے تعصبات پیدا ہوئے ہیں۔ بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ قومی تعصبات کی موجودگی میں اسلام کا ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے چلنا محال ہے، تو سوال یہ ہے کہ اسلامی مقاصد کے بجائے مسلمانوں کے دنیوی مفاد کے لیے جو کشمکش آپکے اور دوسری قوموں کے درمیان برپا ہے اور انکے قوم پرستانہ طریقوں کے جواب میں ویسے ہی قوم پرستانہ طریقے جس طرح آپ اختیار کر رہے ہیں، کیا اس سے یہ تعصبات کبھی قیامت تک بھی دور ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں، تو پھر یہ نہ کہیے کہ اس وقت کچھ خاص حالات ایسے ہیں جنکی وجہ سے اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں چل سکتا، بلکہ یوں فرمائیے کہ آئندہ بھی ہمیشہ ایسے ہی حالات موجود رہینگے اور اگر اسلام آپ ہی کا ورثۂ آبائی بنا رہا تو وہ ہمیشہ بنی اسرائیل کی طرح محض آپکا قومی مذہب بن کر رہیگا، کبھی ایک عالمگیر دعوت نہ بن سکے گا۔

124118
11-7-95

یہ انسانی فطرت کا اقتضاء ہے کہ خود غرضی کے جواب میں خود غرضی اور قوم پرستی کے جواب میں قوم پرستی پیدا ہوتی ہے۔ بخلاف اسکے بے غرضانہ حق پرستی کے مقابلہ میں تمام تعصبات اور تمام مخالفانہ جذبات آخرکار ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور ایک سچے بے لوث حق پرست کے آگے انسان عقیدت و محبت سوا کوئی اور چیز پیش کرنے پر قادر ہی نہیں رہتا۔ اگر مسلمان اپنی وہی حیثیت قائم رکھتے جو دراصل انکی تھی تو یہ ممکن نہ تھا کہ ہندوستان میں ان کے خلاف وہ تعصبات پائے جاتے جنکی آج شکایت کی جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے خود اپنی وہ حیثیت کھو دی۔ دنیوی فائدوں کے لیے دوسری قوموں سے لڑنے جھگڑنے لگے، اور اصولِ حق کے بجائے اپنی اغراضِ ذاتی و قومی کو انہوں نے اپنی جد و جہد کا محور بنا لیا۔ اس کے جواب میں اگر دوسروں کے اندر تعصب نہ پیدا ہوتا تو تعجب کی بات تھی۔ جن اصولوں کا آپ نام لیتے ہیں، اُنکی خود پیروی نہیں کرتے بلکہ رات دن اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں انکے خلاف عمل کرتے رہتے ہیں۔ جس مقصدِ عالی

کا آپ اظہار کرتے ہیں، آپکی عملی جدوجہد اُس مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ آپکے افراد انفرادی طور پر اور آپکی پوری جماعت بحیثیت مجموعی اُسکو پسِ پشت ڈال کر دوسرے مقاصد کے پیچھے چلی جارہی ہے۔ اس صورت میں اگر اپنے خیالی نصب العین اور اپنے محض زبانی اصولوں کے لیے آپکا اپیل دوسروں پر کارگر نہ ہو، اگر وہ اس اپیل پر آپ کو جھوٹا سمجھیں اور آپکی تبلیغ کو محض ایک خود غرضانہ چال سمجھ کر حقارت سے رد کردیں، تو آخر اس میں حیرت کی بات ہی کونسی ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم مسٹر جناح کے ۱۴ یا ۴۲ نکات پر تو ایمان نہیں لاسکتا۔ نہ مسلم لیگ یا مجلس احرار یا جمعیت العلماء کے ریزولیوشنوں میں کوئی ایسی چیز ہے جس پر کوئی ایمان لائے۔ ایمان اگر کوئی لاسکتا ہے تو لا الٰہ الا اللہ پر لاسکتا ہے بشرطیکہ ایک جماعت اسی کلمہ کے لیے جینے اور اسی پر مرنے والی اسکے سامنے موجود ہو۔ مگر وہ ہے کہاں؟ کونسی جماعت آپکے اندر ایسی موجود ہے جس نے خالص اطاعتِ حق کو اپنا مسلک اور خالص دینِ حق کے قیام کو اپنی کوششوں کا مرکز و محور بنالیا ہو؟ لوگ اسلام کی دعوت اور اسکے اصولِ حق کو کتابوں میں دیکھتے ہیں اور انکے معترف ہوجاتے ہیں۔ مگر اس اسلام پر عمل کرنے والی اور اسکے نصب العین کے لیے کام کرنے والی سوسائٹی انکو کہیں نہیں ملتی۔ پھر وہ جائیں تو آخر کہاں جائیں؟ کیا اُس سوسائٹی میں شامل ہوں جو رات دن دنیا ہی کے پیچھے مری جاتی ہے اور انہی راستوں پر چلی جارہی ہے جن پر غیر مسلم چلتے ہیں؟ آپکی ایک جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ارضِ ہند پر انگریز کے بجائے ہندوستانی کا اقتدار قائم ہو۔ بعینہٖ یہی چیز ایک شخص کو غیر مسلم جماعتوں میں بھی مل جاتی ہے۔ پھر وہ آپکے پاس کیوں آئے؟ آپکی دوسری جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ہندو کے مقابلے میں نسلی مسلمانوں کے دنیوی مفاد کا تحفظ کیا جائے۔ یہ چیز اُسکو خود اپنی قوم پرستی کی مد مقابل نظر آتی ہے۔ پھر وہ اپنی قوم پرستی کو چھوڑ کر آپکی قوم پرستی پر کیوں ایمان لائے؟ انسان کو غیر اللہ کے تسلط سے آزاد کرانے والی جماعت آپ میں ہے کہاں کہ کوئی اس کے اصول و مقاصد

پر ایمان لائے اور اس میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھے !

تیسری مشکل سب سے بڑی گتھی جو ہمارے سوچنے والے دماغوں کے لیے ناقابلِ حل بن گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کروڑوں کی تعداد میں ایک ایسی قوم بستی ہے جو نہ پوری مسلمان ہے نہ پوری غیر مسلم۔ اس قوم کے اس حال میں یہاں موجود ہونے سے متعدد پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں جنکا کوئی حل لوگوں کو نہیں ملتا اور اسی وجہ سے رہنما اور کارکن سب پراگندہ عمل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں اُن چند بڑی بڑی الجھنوں کی طرف اشارہ کرونگا جو اس صورتِ حال نے پیدا کر دی ہیں:۔

بعض لوگ لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اصل سوال اسلام کے احیار (Revival) کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیار کا ہے۔ یعنی یہ قوم جو مسلمان کے نام سے پائی جاتی ہے، اس کو ایک زندہ اور طاقتور قوم بنانا اور برسرِ عروج لانا اصل مقصود ہے اور اسی کا نام اسلام کا احیار ہے۔ یہ غلط فہمی انکو "مسلم قوم پرستی" کی حد تک کھینچ لے گئی ہے۔ جس طرح مونجے اور ساورکر کے لیے سوال ہندو قوم کے عروج کا ہے، جس طرح مسولینی کے لیے اطالوی قوم اور ہٹلر کے لیے جرمن قوم کے عروج کا سوال ہے، اسی طرح ان "مسلم قوم پرستوں" کے لیے اصل سوال اُس مسلمان قوم کے عروج کا ہے جس میں یہ پیدا ہوئے ہیں اور جسکے ساتھ انکی قسمتیں وابستہ ہیں۔ یہ اسلام کی خدمت اسکو سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم (قطع نظر اس سے کہ وہ تعلیم کیسی ہی ہو)، انکی معاشی خوشحالی (خواہ وہ کسی قسم کے ذرایع سے حاصل ہو) اور انکی سیاسی و عسکری تنظیم (مجرّد قومی تنظیم) پر اپنا زور صرف کیا جائے، اور اُن کو ایک زبردست قوم بنا دیا جائے۔ پھر جب یہ انکا مقصد قرار پایا تو انہوں نے معاملات کو اس نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ کونسی تدابیر اس مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہو سکتی ہیں۔ اور جو تدبیریں بھی ان کو دنیا میں قومی عروج کے لیے مفید و کارگر نظر آئیں انکو بے تکلف انہوں نے استعمال کرنا شروع کر دیا خواہ وہ اسلام سے انکو کتنی ہی دور لے جانے والی ہوں۔ یہ ذہنیت سرسید احمد خاں کے وقت سے آج تک مسلمانوں کے

اکثر و بیشتر رہنماؤں، کارکنوں اور اداروں پر مسلط ہے۔ اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا جا رہا ہے مسلمانوں کے لیے سوچا جا رہا ہے اور اسلام کی قید سے آزاد ہو کر سوچا جا رہا ہے۔

کچھ دوسرے لوگ اسلام اور مسلمان کو اس حیثیت سے تو خلط ملط نہیں کرتے، لیکن ایک دوسری حیثیت سے وہ اسلام کے مستقبل کو موجودہ نسلی مسلمانوں کے دامن سے باندھ دیتے ہیں۔ وہ چاہتے تو اسلام ہی کا احیاء ہیں، مگر ان کا خیال یہ ہے کہ اسلام کا احیاء موقوف ہے اُن سب مسلمانوں کے مکمل مسلمان بن جانے پر جو اس وقت قومی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ سارے کے سارے مسلمان ذہنی، اخلاقی اور عملی حیثیت سے تبدیل نہ ہو جائیں، قدم آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ اور یہ چیز چونکہ سخت دشوار بلکہ محال نظر آتی ہے، اس لیے یہ لوگ اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے بجائے اِدھر اُدھر کے فضول کاموں میں مختلف ضمنی مقاصد کے پیچھے اپنی قوتیں ضائع کر رہے ہیں۔

کچھ اور لوگ ہیں جن کے سامنے اسلامی نصب العین قریب قریب بالکل واضح ہو چکا ہے اور وہ اس کی طرف بڑھنا بھی چاہتے ہیں مگر یہ سوال ان کو بار بار پریشان کرتا ہے کہ اگر ہمارے کارفرما دماغ اور کارکن ہاتھ سب کے سب اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے میں لگ جائیں تو آخر موجودہ کافرانہ نظام تمدن و سیاست اور اس کے آئندہ تغیرات میں ہماری قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کا کیا حشر ہوگا۔ اس سوال کی اہمیت ان کی نگاہ میں اتنی زیادہ ہے کہ وہ اپنے عزم سفر کو ملتوی کر کے کہتے ہیں کہ پہلے اس سوال کو حل کیا جائے اور اصل مقصد کی طرف قدم اُس وقت بڑھایا جائے جب اپنی قوم کا کوئی مسئلہ ہمارے لیے حل طلب باقی نہ رہے۔

لیکن یہ تمام اُلجھنیں غیر اسلامی طرزِ فکر اور غیر اسلامی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ اگر خالص مسلمان ہونے کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی اُلجھن بھی ہمارے لیے اُلجھن نہیں رہتی۔ ہمارے سامنے اصل سوال کسی قوم کے احیاء کا نہیں بلکہ مسلکِ اسلام کے احیاء کا ہے۔ قوم کے احیاء کا خیال دماغ سے نکالتے ہی وہ تمام مسائل کافور کی طرح اڑ جاتے ہیں جو قومیت کی اصطلاحوں میں سوچنے والے لوگوں کو

پریشان کیا کرتے ہیں۔ جب ہم مسلکِ اسلام کے پیرو ہیں اور اسکو فروغ دینا ہمارا مقصد ہے تو ہمیں کسی ایسے مفاد سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں ہو سکتی جو کسی غیر اسلامی نظام سے وابستہ ہو یا اصول اسلام سے متصادم ہو۔ ہم اپنے دماغ کو اُس کے لیے سوچنے کی کچھ بھی زحمت نہ دینگے۔ قومی احیاء کی اُن تمام تدبیروں سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہ ہوگا جو غیر اسلامی اصول پر مبنی ہوں۔ ایک قوم اور دوسری قوم کی باہمی کشمکش، اور ایک قوم پر دوسری قوم کے تفوق کی کوششوں سے بھی ہم پوری تبرّی کرینگے ہم کو جو کچھ بھی دلچسپی ہوگی اسلامی نظام فکر و عمل سے، اسکی تبلیغ و اشاعت سے، اور اسکو حکمراں بنانے کی سعی و جہد سے ہوگی۔ مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف اسی حد تک ہوگا جس حد تک ان کا تعلق اسلام سے ہے جو اپنی خواہش نفس اور ہر غیر اللہ کی بندگی چھوڑ کر صرف اللہ کی بندگی میں آجائے وہ ہمارا بھائی اور ہمارا رفیق ہے، خواہ وہ نسلی مسلمانوں میں سے آئے یا غیر مسلموں میں سے۔ ہم پیدائشی مسلمانوں کو بھی اسی مسلک کی طرف دعوت دینگے اور پیدائشی غیر مسلموں کو بھی۔ ہمارے نزدیک اسلام کا دامن نسلی مسلمانوں کے دامن سے بندھا ہوا نہ ہوگا کہ یہ اٹھیں تو وہ بھی اٹھے اور یہ نہ اٹھیں تو وہ بھی نہ اٹھے۔ اسلام اِن کے باپ دادا کی جائداد نہیں ہے۔ یہ اُسکے لیے جینے اور اُسی کے لیے مرنے پر تیار رہوں تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔ ورنہ جس جہنم میں اِن کا جی چاہے جا کر گر جائیں۔ ہم اللہ کا کلمہ دوسرے انسانوں کے پاس لے جائینگے۔

یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں بعینہٖ یہی طرزِ عمل انبیاء و رسل کا تھا اور اسی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ قرآن میں جن کو اہلِ کتاب کہا گیا ہے وہ آخر "نسلی مسلمان" ہی تو تھے۔ خدا اور ملائکہ اور نبی اور کتاب اور آخرت، سب کو مانتے تھے، اور عبادات و احکام کی رسمی پیروی بھی کرتے تھے۔ البتہ اسلام کی اصل روح، یعنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دینا اور دین میں شرک نہ کرنا، یہ چیز اُن میں سے نکل گئی تھی۔ اب دیکھیے، کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس "نسلی مسلمان قوم" کے

احیار بر اپنی کوششوں کو مرکوز فرمایا تھا؟ نہیں۔ کیا آپ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک یہ سارے کے سارے "نسلی مسلمان" اصلی مسلمان نہ بن جائینگے قدم آگے نہ بڑھایا جائیگا؟ یہ بھی نہیں۔ کیا آپ نے ان "نسلی مسلمانوں" کے دنیوی مسائل کو حل کرنے تک اقامتِ دین کی کوششوں کو ملتوی رکھا تھا؟ یہ بھی نہیں۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ سب جانتے ہیں کہ آپ نے تمام معاملات اور تمام مسائل سے قطع نظر کر کے "نسلی مسلمانوں" اور غیر مسلموں، سب کو خالص اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دی، جس نے اسکو قبول کیا اور غیر اللہ کی بندگی واطاعت ترک کر دی اسے اپنے جتھے میں شامل کر لیا اور پھر ان لوگوں کو لے کر الٰہی نظام اطاعت یعنی دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے براہِ راست جدوجہد شروع کر دی یہاں تک کہ اسکو قائم کر کے چھوڑا۔

ٹھیک یہی طریقہ ہے جسکی پیروی کو میں حق سمجھتا ہوں، اسی کی پیروی خود کرنا چاہتا ہوں، اور اسی کا مشورہ ان سب لوگوں کو دیتا ہوں جن کا نصب العین اسلامی ہے۔

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے

اس مقالہ میں مجھے اُس عمل Process کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ آجکل میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلامی حکومت کا نام بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے مختلف حلقوں سے اس تصور اور اس مقصد کا اظہار ہو رہا ہے مگر ایسے ایسے عجیب راستے اس منزل تک پہنچنے کے لیے تجویز کیے جا رہے ہیں جن سے وہاں تک پہنچنا اتنا ہی محال ہے جتنا موٹر کار کے ذریعے سے امریکہ تک پہنچنا۔ اس خام خیالی (Loose-thinking) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو، مگر خالص علمی (Scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے، اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ کیونکر قائم ہوا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علمی طریق پر اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔

نظام حکومت کا طبعی ارتقاء

جو لوگ اجتماعیات میں کچھ بھی نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بنکر تیار ہو اور پھر اُدھر سے لا کر اسکو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اسکی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اندر اخلاقی، نفسیاتی، تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔ اسکے لیے کچھ ابتدائی لوازم (Prerequisites) کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جنکے فراہم ہونے اور زور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے۔ جس طرح منطق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیب ہی سے برآمد ہوا کرتا ہے، جس

طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیاوی مرکب ہمیشہ کیمیاوی کشش رکھنے والے اجزاء کے مخصوص طریقہ پر ملنے ہی سے برآمد ہوتا ہے، اسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ایک حکومت صرف اُن حالات کے اقتضاء کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائٹی میں بہم ہو گئے ہوں۔ پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکلیہ اُن حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اسکی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ مقدمات کسی نوعیت کے ہوں اور انکی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور نکل آئے، کیمیاوی اجزاء کسی خاصیت کے ہوں اور انکو ملانے سے مرکب کسی اور قسم کا بن جائے، درخت لیموں کا لگایا جائے اور نشوونما پاکر وہ پھل آم کے دینے لگے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں، انکے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشوونما کے لیئے مناسب ہو، مگر ارتقائی مراحل سے گذر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو انہیں اسباب اور اسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی نوعیت کی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجیے کہ میں یہاں جبریت (Determinism) کو دخل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ و اختیار کی نفی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے، مگر میں دراصل یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظامِ حکومت پیدا کرنا مقصود ہو، اسی کے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اسی کی طرف لے جانے والا طرزِ عمل اختیار کرنا بہرحال ناگزیر ہے۔ سب سے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اٹھے، اسی قسم کے انفرادی کیرکٹر تیار ہوں، اسی طرح کا جماعتی اخلاق بنے، اسی طرز کے کارکن تربیت کیے جائیں، اسی ڈھنگ کی لیڈرشپ ہو، اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جسکا اقتضاء اُس خاص نظامِ حکومت کی نوعیت فطرۃً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جدوجہد سے انکے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ انکی طیار کی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظامِ حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے

تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظامِ حکومت ابھر آتا ہے جسکے لیے ان طاقتور اسباب نے جد و جہد کی ہے بالکل اُسی طرح جس طرح کہ ایک بیج سے جب درخت پیدا ہوتا ہے اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشوونما کی ایک خاص حد پر پہنچ کر اس میں وہی پھل آنے شروع ہو جاتے ہیں جنکے لیے اسکی فطری ساخت زور کر رہی تھی۔ اس حقیقت پر جب آپ غور کرینگے تو آپکو یہ تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ ہوگا کہ جہاں تحریک، لیڈرشپ، انفرادی سیرت، اجتماعی اخلاق، اور حکمتِ عملی، ہر ایک چیز ایک نوعیت کے نظامِ حکومت پیدا کرنے کے لیے موزوں و مناسب ہو، اور امید یہ کی جائے کہ انکے نتیجہ میں بالکل ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہوگا، وہاں بے شعوری، خام خیالی اور خام کاری کے سوا اور کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

اصولی حکومت

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ حکومت جسکو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں، اسکی نوعیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قومیت کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ مجرد ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں میں اسکو Ideological state کہونگا۔ یہ "اصولی حکومت" وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ ناآشنا رہی ہے اور آج تک ناآشنا ہے۔ قدیم زمانہ میں لوگ صرف خاندانوں، یا طبقوں کی حکومت سے واقف تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقف ہوئے۔ محض ایک اصول کی حکومت، اس بنیاد پر کہ جو اس اصول کو قبول کرے وہ بلا لحاظ قومیت اسٹیٹ کو چلانے میں حصہ دار ہوگا، دنیا کے تنگ ذہن میں کبھی نہ سما سکی۔ عیسائیت نے اس تخیل کا ایک بہت ہی دھندلا سا نقش پایا، مگر اسکو وہ مکمل نظامِ فکر نہ مل سکا جسکی بنیاد پر کوئی اسٹیٹ تعمیر ہوتا۔ انقلاب فرانس میں اصولی حکومت کے تخیل کی ایک ذرا سی جھلک انسان کی نظر کے سامنے آئی مگر نیشنلزم کی تاریکی میں گم ہوگئی۔ اشتراکیت نے اس تخیل کا خاصا چرچا کیا، حتی کہ ایک حکومت بھی اسکی بنیاد پر تعمیر کرنیکی کوشش کی، اور اس کی وجہ سے دنیا کی سمجھ میں یہ تخیل کچھ کچھ آنے لگا تھا، مگر اسکی رگ و پے میں بھی آخر کار نیشنلزم گھس گیا۔ ابتدا سے آج تک تمام

دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شائبہ سے پاک کر کے حکومت کا ایک نظام خالص آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو قبول کر کے غیر قومی حکومت بنائیں۔

یہ چیز چونکہ نرالی ہے، اور گرد و پیش کی تمام دنیا اسکے خلاف چل رہی ہے اسلیے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اسکو اور اسکے جملہ تضمنات (Implications) کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں مگر جنکے اجتماعی تصورات تمام تر یورپ کی تاریخ اور یورپ ہی کے سیاسیات اور علوم عمران Social sciences سے بنے ہیں، انکے ذہن کی گرفت میں یہ تصور کسی طرح نہیں آتا۔ بیرون ہند کے ممالک جنکی بیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہے، وہاں اس قسم کے لوگوں ہاتھ میں جب زمام کار آئی تو انکو حکومت کا کوئی نقشہ قومی حکومت National state کے سوا نہ سوجھا کیونکہ وہ اسلامی علم و شعور اور اصولی حکومت کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھے۔ ہندوستان میں بھی جن لوگوں نے اس طرز کی دماغی تربیت پائی ہے وہ اسی مشکل میں مبتلا ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں مگر بیچارے اپنے ذہن کی ساخت سے مجبور ہیں کہ پھر پھرا کر جو نقشہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے قومی حکومت ہی کا آتا ہے، قوم پرستانہ طرز فکر Nationalistic ideology ہی میں دانستہ و نادانستہ پھنس جاتے ہیں، اور جو پروگرام سوچتے ہیں وہ بنیادی طور پر قوم پرستانہ ہی ہوتا ہے۔ انکے نزدیک پیش نظر مسئلہ کی نوعیت بس یہ ہے کہ جو مسلمان انکے نام سے جو ایک "قوم" بن گئی ہے اسکے ہاتھ میں حکومت آجائے یا کم از کم اسکو سیاسی اقتدار نصیب ہو جائے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے یہ حتی الامکان بھی دماغ پر زور ڈالتے ہیں، اسکے سوا کوئی طریق کار انہیں نظر نہیں آتا کہ دنیا کی قومیں عموماً جو تدابیر اختیار کیا کرتی ہیں وہی اس قوم کے لیے بھی اختیار کی جائیں، جن اجزا سے یہ قوم مرکب ہے انکو جوڑ کر ایک ٹھوس مجموعہ بنایا جائے، ان میں نیشنلزم کا جوش پھونکا جائے، انکے اندر مرکزی اقتدار ہو، انکے نیشنل گارڈس منظم ہوں، انکی ایک قومی ملیشیا تیار ہو، وہ جہاں اکثریت

یں ہوں وہاں اقتدار اکثریت (Majority-rule) کے مسلّم جمہوری اصول پر انکے قومی اسٹیٹ بن جائیں اور جہاں انکی تعداد کم ہو وہاں اُنکے "حقوق" کا تحفظ ہو جائے، انکی انفرادیت اُسی طرح محفوظ ہو جس طرح دنیا کے ہر ملک میں ہر قومی اقلیت (National minority) اپنی انفرادیت محفوظ کرنا چاہتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی اور انتخابی ادارات میں انکا حصہ مقرر ہو، اپنے نمائندے یہ خود چُنیں، وزارتوں میں ایک قوم کی حیثیت سے یہ شریک کیے جائیں، وغیر ذالک من القومیات - یہ سب باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ امت، جماعت، ملت، ملیت، امیر، اطاعت امیر اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لیکر بولتے ہیں، مگر اسلامی فکر کے اعتبار سے یہ سب انکے لیے مذہب قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں جو خوش قسمتی سے پرانے ذخیرے میں گھڑے گھڑائے مل گئے اور غیر اسلامی فکر کو چھپانے کے لیے اسلامی رنگ کے غلاف کا کام دینے لگے -

اصولی حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپکو یہ بات سمجھنے میں ذرہ برابر بھی دقت پیش نہ آئیگی کہ اسکی بنا رکھنے کے لیے یہ طرز فکر، یہ انداز تحریک، یہ عملی پروگرام نقطۂ آغاز کا بھی کام نہیں دے سکتا، کجا کہ تعمیر کے انجام تک پہنچا سکے - بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسکا ہر جز ایک تیشہ ہے جس سے اصولی حکومت کے تخیل کی جڑ کٹ جاتی ہے - اصولی حکومت کے تخیل کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ ہمارے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں، صرف انسان ہیں، ہم اُنکے سامنے ایک اصول اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اس پر تمدن کا نظام اور حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کرنے میں اُن کی اپنی فلاح ہے اور جو اسکو قبول کرلے وہ اس نظام کو چلانے میں برابر کا حصہ دار ہے۔ غور کیجیے، اس تخیل کو لیکر وہ شخص کس طرح اٹھ سکتا ہے جسکے دماغ، زبان، افعال و حرکات، ہر چیز پر قومیت اور قوم پرستی کا ٹھپا لگا ہوا ہو - اس نے تو وسیع تر انسانیت کو اپیل کرنیکا دروازہ پہلے ہی بند کر دیا، پہلے ہی قدم پر اپنی پوزیشن کو آپ غلط کر کے رکھ دیا - قوم پرستی کے تعصب میں جو قومیں اندھی ہو رہی ہیں، جنکے لڑائی جھگڑوں کی ساری بنیاد ہی نیشنلزم اور نیشن اسٹیٹس ہیں، انکو انسانیت کے نام پر پکارنے اور انسانی فلاح کے اصول کی طرف بلانے کا آخر یہ کونسا ڈھنگ ہے کہ ہم خود اپنے قومی حقوق کے جھگڑے اور

اپنے مِشن اسٹیٹ کے مطالبہ سے اس دعوت کی ابتدا کریں؟ کس طرح آپ کی عقل یہ بات قبول کرتی ہے کہ مقدمہ بازی سے لوگوں کو روکنے کی تحریک خود ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنے سے شروع کی جاسکتی ہے؟

خلافت الٰہیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسکی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔ اسکا بنیادی نظریہ[1] یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے۔ وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اسکے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے، اور یہ حیثیت صحیح طور پر صرف دو صورتوں سے قائم ہوسکتی ہے: یا تو کسی انسان کے پاس براہ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستورِ حکومت آیا ہو، یا وہ اُس شخص کی پیروی اختیار کرے جسکے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہے۔ اِس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہونگے جو اس قانون پر ایمان لائیں اور اسکی پیروی کرنے پر تیار ہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائیگا کہ ہم سب بحیثیت مجموعی، اور ہم میں سے ہر ایک فرداً فرداً خدا کے سامنے جوابدہ ہے، اُس خدا کے سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، جسکے علم سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی، اور جس کی گرفت سے مر کر بھی ہم نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی ہے، یہ اسلیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلائیں، انکو اپنا غلام بنائیں، انکے سر اپنے آگے جھکوائیں، ان سے ٹیکس وصول کر کے اپنے محل تعمیر کریں، حاکمانہ اختیارات سے کام لیکر اپنے عیش، اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریائی کا سامان کریں، بلکہ یہ بار ہم پر اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانونِ عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اس قانون کی

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا رسالہ "اسلام کا نظریۂ سیاسی"۔

پابندی اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی، نفس پرستی، تعصب، جانب داری یا بد دیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائینگے خواہ دنیا میں ہر سزا سے محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لیکر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں Secular states سے بالکل مختلف ہے۔ اسکی ترکیب، اس کا مزاج، اُسکی فطرت کوئی چیز بھی ان سے نہیں ملتی۔ اُسکو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اُسکی فوج، اُسکی پولیس، اُسکی عدالت، اُسکے مالیات، اُسکے قوانین، اُسکے محاصل، اُسکی انتظامی پالیسی، اُسکی خارجی سیاست، اُسکی صلح و جنگ کے معاملات، سب کے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہیں۔ انکی عدالتوں کے جج اور چیف جسٹس اُسکی عدالت کے کلرک بلکہ چپراسی تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ انکی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانسٹیبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں ٹھہرتے۔ انکے جنرل اور فیلڈ مارشل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ انکے وزرائے خارجیہ وہاں کسی منصب پر تو کیا مقرر ہونگے، شائد اپنے جھوٹ، دغا اور بد دیانتیوں کی بدولت جیل جانے سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ جو ان حکومتوں کے کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں، جنکی اخلاقی و ذہنی تربیت ان کے مزاج کے مناسب حال کی گئی ہو، اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ ہیں۔ اُسکو اپنے شہری، اپنے ووٹر، اپنے کونسلر، اپنے اہل کار، اپنے سپاہی، اپنے جج اور مجسٹریٹ، اپنے محکموں کے ڈائرکٹر، اپنے فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفراء اور اپنے وزیر، غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء، اپنی انتظامی مشین کے تمام پرزے، بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اسکو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں، جنکی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ ہو، جو ہر حال

میں اُس ضابطہ اور اُس طرزِ عمل کے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے، جنکی تمام سعی وجہد کا ہدف مقصود خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مسلط نہ ہو، جو تنگ نظری و تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نشے میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں، جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں، جنکی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے اُن کے دستِ قدرت میں آئیں تو وہ پکے امانت دار ثابت ہوں، جب بستیوں کی حکومت اُن کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ انکی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں، جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو اُن سے قتل و غارتگری، ظلم و ستم اور بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو، بلکہ ان کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عورتوں کی عصمت کا محافظ پائیں، جنکی دھاک بین الاقوامی سیاست میں اس درجہ کی ہو کہ انکی راستی، انصاف پسندی، اصولِ اخلاق کی پابندی اور عہد و پیمان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اِس قسم کے اور صرف اسی قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے اور یہی لوگ اسکو چلا سکتے ہیں۔ رہے مادہ پرست، افادی ذہنیت (utilitarian mentality) رکھنے والے لوگ جو دنیوی فائدوں اور شخصی یا قومی مصلحتوں کی خاطر ہمیشہ ایک نیا اصول بناتے ہوں، جنکے پیشِ نظر نہ خدا ہو نہ آخرت، بلکہ جنکی ساری کوششوں کا مرکز و محور اور ساری پالیسیوں کا مدار صرف دنیوی فائدہ و نقصان ہی کا خیال ہو، وہ ایسی حکومت بنانے یا چلانے کے قابل تو کیا ہونگے، ان کا اس حکومت کے دائرے میں موجود ہونا ہی ایک عمارت میں دیمک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

اسلامی انقلاب کی سبیل

اسلامی حکومت کی اس نوعیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس منزل تک پہنچنے کی سبیل کیا ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، کسی سوسائٹی میں جس قسم کے فکری، اخلاقی، تمدنی اسباب و

محرکات فراہم ہوتے ہیں، انکے تعامل سے اسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کونپل سے لیکر پورا درخت بننے تک تو لیموں کی حیثیت سے نشوونما پائے، مگر بارآوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک آم کے پھل دینے لگے۔ اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اسکے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جسکی بنیاد میں وہ نظریہ حیات، وہ مقصد زندگی، وہ معیار اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اسکے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا[1] ایک نیا نظام اُٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین مالیات و معاشیات، مسلم ماہرین قانون، مسلم ماہرین سیاست، غرض ہر شعبہ علم وفن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت موجود ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کر سکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخداشناس ائمہ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست (Intellecrual leadership) کا سکہ جما دیں۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گردوپیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اسکے علمبردار مصیبتیں اٹھاکر، سختیاں جھیل کر قربانیاں کرکے، مار کھاکر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں، آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جسکو ہر پرکھنے والا ہر طرح جانچ کر بے کھوٹ کامل العیار سونا ہی پائے، اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اُس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جسکے علمبردار بن کر وہ اٹھے ہیں، اور انکی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث، بے غرض، راستباز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، با اصول، خدا ترس لوگ

[1] ملاحظہ ہو میرا مضمون "نیا نظام تعلیم" مندرجہ ترجمان القرآن (بابت ماہ شوال و ذی القعدہ ۵۹ھ)

انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں، اُس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔ اس طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جنکی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے، اس تحریک میں کھنچ آئینگے، پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات تحریک کے مقابلہ میں دبتے چلے جائینگے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا، اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائیگی، اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائیگا۔ آخر کار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی نظام حکومت قائم ہو جائیگا جسکے لیے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہوگی، اور جونہی کہ وہ نظام قائم ہوگا، اسکو چلانے کے لیے ابتدائی اہلکاروں سے لیکر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کل پرزے اُس نظام تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہونگے جسکا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔

یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اُس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جسکو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب اُسی نوعیت کی تحریک، اُسی نوعیت کے لیڈر اور کارکن، اور اسی نوعیت کا اجتماعی شعور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلاب فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی اساس درکار تھی جو روسو، والٹیر اور مانٹسکیو جیسے لیڈروں نے تیار کی۔ انقلاب روس صرف مارکس کے افکار اور لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈرشپ اور اُن ہزارہا اشتراکی کارکنوں ہی کی بدولت رونما ہو سکتا تھا جنکی زندگیاں اشتراکیت کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔ جرمنی کا نیشنل سوشلزم اُس مخصوص اخلاقی، نفسیاتی اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جسکو ہیگل، فشتے، گیٹے، نطشے اور بہت سے مفکرین کے نظریات اور ہٹلر کی لیڈرشپ نے تیار کیا۔ اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جبکہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات و تصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری

ذہنی، اخلاقی، نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقت ور جدوجہد سے بدل ڈالے۔ یہ بات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قوم پرستانہ نوعیت کی کوئی تحریک، جسکا پس منظر یہ ناقص نظام تعلیم ہو جو اس وقت ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، اور جسکی بنیاد افادی اخلاقیات (Utilitarian morals) اور مصلحت پرستی (Pragmatism) پر ہو، اسلامی انقلاب آخر کس طرح برپا کر سکتی ہے؟ میں اس قسم کے معجزات پر یقین نہیں رکھتا جن پر فرانس کے سابق وزیر اعظم موسیو رینو یقین رکھتے تھے[1]۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ جیسی تدبیر کی جائیگی ویسے ہی نتائج برآمد ہونگے۔

خام خیالیاں

ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم تمام دردوں کی دوا ہے۔ "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں، اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں۔ لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریق کار اختیار کریگی خواہ وہ ہندو قوم ہو، یا سکھ، یا جرمن، یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر ہو اور جس میں حکم چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو، ہر قوم کی سربلندی کے لیے مفید ہوتا ہے، خواہ وہ موسجے یا ساورکر ہو، یا ہٹلر یا مسولینی۔ ایسے ہزاروں لاکھوں نوجوان جو قومی عزائم کے لیے اپنے لیڈر کی اطاعت میں منظم حرکت کر سکتے ہوں، ہر قوم کا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ جاپانیت پر ایمان رکھتے ہوں یا چینیت پر۔ پس اگر "مسلمان" ایک نسلی و تاریخی قومیت کا نام ہے اور پیش نظر مقصد صرف اسکا بول بالا کرنا ہے تو اسکے لیے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جا رہی ہے۔ اس کے

[1] موجودہ جنگ میں فرانس کی شکست سے چند روز پہلے موسیو رینو نے، جو اس وقت وزیر اعظم تھے، ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اب فرانس کو صرف ایک معجزہ ہی بچا سکتا ہے اور میں معجزات پر یقین رکھتا ہوں"۔

نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسر آسکتی ہے اور بدرجۂ اقل وطنی حکومت میں اچھا خاصا حصہ بھی مل سکتا ہے لیکن اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں بلکہ الٹا قدم ہے۔

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے وقت اتنا ہی خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پاکر یا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پاکر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اسکی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کر کے ایک منظم گلّہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے اُنکو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا، یا فوجی تربیت سے اُن میں بھیڑیے کی درندگی پیدا کرنا جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لیے تو ضرور مفید ہو سکتا ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کون انکی اخلاقی برتری تسلیم کریگا؟ کس کی نگاہیں انکے سامنے عزت سے جھکینگی؟ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہوگا؟ کہاں انکے "انفاسِ قدسیہ" سے يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللهِ أَفْوَاجًا کا منظر دکھائی دے سکیگا؟ کس جگہ انکی روحانی امامت کا سکّہ جمیگا؟ اور زمین پر بسنے والے کہاں انکا خیر مقدم اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے کرینگے؟ اعلائے کلمۃ اللہ جس چیز کا نام ہے اس کے لیے تو صرف اُن کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر فائدہ و نقصان کی پروا کیے بغیر جمنے والے ہوں، خواہ وہ اس نسلی مسلمان قوم میں سے ملیں یا کسی دوسری قوم سے بھرتی

ہو کر آئیں - ایسے دس آدمی اس مقصد کے لیے زیادہ قیمتی ہیں بہ نسبت اسکے کہ وہ انبوہ جسکا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں، ۲۵ یا ۵۰ لاکھ کی تعداد میں بھرتی ہو جائے - اسلام کو تانبے کے اُن سکّوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہو - وہ سکّے کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ اِن نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں - ایسا ایک سکّہ اُن جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اسکے نزدیک زیادہ قیمتی ہے ـــــ پھر جس لیڈرشپ کی اِعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ضرورت ہے، وہ ایسی لیڈرشپ ہے کہ اُن اصولوں سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو جنکا بول بالا کرنے کے لیے اسلام اٹھا ہے، خواہ اِس ہٹ کی بدولت تمام مسلمان بھوکے ہی کیوں نہ مر جائیں بلکہ تہ تیغ ہی کیوں نہ کر دیے جائیں - ہر معاملہ میں اپنی قوم کا فائدہ تلاش کرنے والی اور اصول سے بے نیاز ہو کر ہر اُس تدبیر کو جس میں قوم کی دنیوی فلاح نظر آئے، اختیار کر لینے والی لیڈرشپ اور وہ لیڈرشپ جس میں تقویٰ اور خدا ترسی کا رنگ مفقود ہو، اُس مقصد کے لیے قطعی ناکارہ ہے جس پر اسلام نے اپنی نظر جما رکھی ہے -

پھر، نظامِ تعلیم و تربیت جسکی بنیاد اِس مشہور مقولہ پر رکھی گئی ہے کہ "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"، اُس اسلام کی خدمت کے لیے کس طرح موزوں ہو سکتا ہے جس کا قطعی ناقابلِ ترمیم فیصلہ یہ ہے کہ ہوا خواہ کسی طرف کی ہو، تم بہرحال اس راستہ پر چلو جو خدا نے تمہارے لیے معین کر دیا ہے - میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر آپکو ایک خطۂ زمین حکومت کرنے کے لیے دے بھی دیا جائے تو آپ اسلامی اصول پر اُسکا انتظام ایک دن بھی نہ چلا سکینگے - اسلامی حکومت کی پولیس، عدالت، فوج، مالگزاری، فینانس، تعلیمات، اور خارجی پالیسی کو چلانے کے لیے جس ذہنیت اور جس اخلاقی روح رکھنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے، انکو فراہم کرنے کا کوئی بندوبست آپنے نہیں کیا ہے - یہ تعلیم جو آپکے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جا رہی ہے، غیر اسلامی حکومت کے لیے سیکرٹری اور وزراء تک فراہم کر سکتی ہے، مگر برا نہ مانیے، اسلامی عدالت کے لیے چپراسی اور اسلامی پولیس کے لیے کانسٹیبل تک فراہم نہیں کر سکتی - اور یہ بات جدید تعلیم ہی تک محدود نہیں ہے - ہمارا وہ پرانا نظامِ

تعلیم جو حرکتِ زمین کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے، وہ بھی اس معاملہ میں اتنا ناکارہ ہے کہ اس دورِ جدید میں اسلامی حکومت کے لیے ایک قاضی، ایک وزیرِ مال، ایک وزیرِ جنگ، ایک ناظم تعلیمات اور ایک سفیر بھی مہیا نہیں کر سکتا اس تیاری پر اسلامی حکومت کا حوصلہ اسوائے اسکے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ یہ نام زبان پر لاتے ہیں اُنکے ذہن اسلامی حکومت کے صحیح تصور سے خالی ہیں۔

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اسکو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اسکی بنا پر میں اسکو ناممکن سمجھتا ہوں، اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اسکو ایک معجزہ سمجھونگا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ عمر ابن عبدالعزیز جیسا زبردست فرمانروا جسکی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے، کیونکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ مامون الرشید جیسا با جبروت حکمراں نظام حکومت میں نہیں صرف اسکی اوپری شکل میں خفیف سی تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جبکہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہوگا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جنکو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیریکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے، تو انکے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر

پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملیگا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت"، جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، وہ "مسلم قومی حکومت" انکی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دیگی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمتہ اللہ علیہ ہی رہینگے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہوسکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑیگی، اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر، بلکہ اُس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا، تو ہم آج ہی سے یہ راہِ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اُس نام نہاد "مسلم حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اُسکے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جسکے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِ راہ ثابت ہوگی؟

اسلامی تحریک کا مخصوص طریق کار

اب میں ایک مختصر تاریخی بیان کے ذریعہ سے اس امر کی تشریح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے لیے اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے اور از سر نو تیار کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے، اور اس جدوجہد کا وہ مخصوص طریق کار (Technique) کیا ہے جس سے یہ کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے۔

اسلام دراصل اُس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اسکے

لیڈر وہ لوگ تھے جنکو رُسُل اللہ (خدا کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ انہی لیڈروں کے طرزِ عمل کی پیروی کرنی ہوگی، کیونکہ اسکے سوا کوئی اور طرزِ عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاء گذرے ہیں اُنکے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل سکیم نہیں بن سکتی۔ بائیبل کے عہد جدید ([illegible]) میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اسکو سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے[1]۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدتمندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے ہم اسی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جنکی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لیکر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی، اور نظم مملکت کے نہج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہذا میں اسی ماخذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے ہیں تو آپکو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے

[1] چونکہ مسیح علیہ السلام کا طریق تعلیم و تربیت بھی اس تحریک کے ابتدائی مرحلہ کو سمجھنے کے لیے مفید ہے اسلیے انجیل متی و لوقا کے چند اقتباسات اس مضمون کے ضمیمہ کے طور پر آخر میں درج کردیے گئے ہیں۔

اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع (Economic Exploitation) بھی ہو رہا تھا۔ اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپکے اپنے ملک میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخن تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی، اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گروہ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سودخواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکّہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اسکے ہم مذہب اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الہوں کو چھوڑ دو اور صرف اُسی ایک الٰہ کی بندگی قبول کرو۔

اسکی وجہ یہ نہ تھی کہ اُس رہنما کی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے یا وہ کسی توجہ کے لائق ہی نہ تھے۔ آپکو معلوم ہی ہے کہ آگے چل کر اُس نے ان سب مسئلوں کی طرف توجہ کی اور سب کو ایک ایک کر کے حل کیا۔ مگر ابتدا میں سب طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپکو خودمختار (Independent) اور غیر ذمہ دار (Irresponsible) سمجھنا، بالفاظ دیگر آپ اپنا الٰہ بننا ہے، یا پھر یہ ہے کہ وہ الٰہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحب امر تسلیم کرے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی

رو سے کوئی اوپری اصلاح، انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی ایک طرف سے خرابی کو دور کیا جائیگا اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لیگی۔ لہذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے، اور اسکی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹائے سے مٹ سکتی ہے، نہ تو اس کے حدود سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اس امٹ اور اٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عائد ہوگا۔ عقل اور حقیقت پسندی (Realism) کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اسکے حکم کے آگے سر جھکا دے اور مطیع بندہ بنکر رہ۔ دوسری طرف اس کو واقعہ کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختار کار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا حکم چلتا ہے۔ اسلیے تو اُسکے سوا کسی کا بندہ نہ بن۔ کسی کا حکم نہ مان۔ کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہز مجسٹی نہیں ہے۔ مجسٹی اسی ایک کے لیے مختص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہائی نس نہیں ہے۔ ہائی نس صرف ایک ہی کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے۔ ہولی نس ساری کی ساری اسی ایک کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈشپ نہیں ہے۔ لارڈشپ بالکلیہ اسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز (Law-giver) نہیں ہے۔ قانون اسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی ان داتا، کوئی راجہ یا مہاراجہ، کوئی ولی و کارساز، کوئی دعائیں سننے والا اور فریادرس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب کے سب بندے ہی بندے ہیں۔ رب اور مولیٰ صرف ایک ہے۔ لہذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کردے اور اُسی ایک کا غلام، مطیع اور

پابندِ حکم بن جا۔ یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھڑ کر از سر نو ایک نئے نقشہ پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لیکر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہونگے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقہ سے حل ہوتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہِ راست پیش کر دیا۔ انہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہ کیا کہ پہلے کچھ سیاسی یا سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اس اثر سے کام لیکر کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کیے جائیں، پھر ان اختیارات سے کام لیکر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک بڑھا لائیں۔ یہ سب کچھ، کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا اور چھوٹتے ہی اس نے لا الٰہ الا اللہ کا اعلان کر دیا۔ اس سے کم کسی چیز پر اسکی نظر ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹھیری۔ اسکی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور تبلیغی جوش نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار یہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے، اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتا۔ جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہیں، وہ اس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتے۔ اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو آپکی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آئیں، اسی چیز میں انکے لیے کشش ہو، اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں، اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اٹھیں لہٰذا اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز اسی دعوتِ توحید سے کیا جائے۔

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری، یا غیر اللہ کی حاکمیت و الوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپکے موذنوں کو اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

کی صدا بلند کرتے ہوئے اسلیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنیٰ اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے، اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے، کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود و اختیارات (Jurisdiction) مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آجائیگی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپکے دشمن ہو گئے ہیں، اور ہر طرف آپکے لیے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔

یہی صورت اُس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا، اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اسلیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس آواز کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق (Racial Superiority) کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقے کا، غرض ہر بت کے پرستار کو اپنے بت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہوا، اسلیے الکفر ملۃ واحدۃ، وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جنکا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے، جنکے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق

یہ ہے تو اسکی خاطر آگ میں کود نے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک دو دو چار چار کرکے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا۔ کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست، آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی، کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں، ان کا آنا ضروری تھا، ان کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

ان کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے کیرکٹر اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسلِ آدم کا بہترین جوہر تھا جسکی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اسکے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بھٹی میں سے گذر کر آئے۔

پھر جو لوگ آئے انکو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے، یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے، خدا اور اسکی رضا کے لیے۔ اسی کے لیے وہ پٹے، اسی کے لیے بھوکے مرے، اسی کے لیے دنیا بھر کی جفاکاریوں کا تختۂ مشق بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی گئی جسکی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیرکٹر پیدا ہوا۔ انکی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیت اسلامی کا طاری ہونا ایک طبعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اسکی راہ میں کشمکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گذرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اس مقصد کی تمام کیفیات اسکے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اسکی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے

اس چیز کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے نماز اُن پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا ہر امکان دور ہو جائے۔ اپنے نصب العین پر انکی نگاہ جمی رہے۔ جسکو وہ حاکم مان رہے ہیں اسکی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے اپنے عقیدہ میں مضبوط ہو جائیں۔ جسکے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اس کا عالم الغیب والشہادہ ہونا، اس کا مالک یوم الدین ہونا، اسکا قاہر فوق عبادہ ہونا پوری طرح انکے ذہن نشین ہو جائے اور کسی حال میں اسکی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک انکے دل میں نہ آنے پائے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی۔ اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹے جا رہے ہیں، قید کیے جا رہے ہیں، گھروں سے نکالے جا رہے ہیں، تو خواہ مخواہ انکے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی انکی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اسلیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے، تو انکے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اُس چیز کو معلوم کریں، آخر ایسی کیا چیز ہے جسکے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لا الٰہ الا اللہ، اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے، اور اس دعوت کو لیکر ایسے لوگ اٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں تو انکی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ انکے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جنکو ذاتی وجاہت کے تکبر، یا اجداد پرستی کی جہالت، یا اغراض دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا، اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا، مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند اور بے لوث آدمی کو اسکی طرف کھنچنا ہی پڑا۔

اس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جسکے لیے یہ تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ انکی ہر بات، ہر فعل، اور ہر حرکت سے اسلام کی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جسکی تشریح کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصراً چند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کرونگا۔

انکی بیوی حضرت خدیجہ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں اور وہ انکے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرت کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہوجانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اسکو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں لٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملک التجار تھا، اسکو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپکو اپنا بادشاہ بنا لینگے، عرب کی حسین ترین عورت آپکے نکاح میں دینگے، دولت کے ڈھیر آپکے قدموں میں لگا دینگے بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہوگیا۔

قریش کے اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمد! ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سنیں جبکہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے زیادہ نیچے طبقہ کے لوگ ہیں انکو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان، بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اٹھے ہیں، اور اسی چیز نے آپکی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے کبھی بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو کسی طرح بچالوں، تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اٹھتے تو حبش کے بلال، روم کے صہیب اور فارس کے سلمان کو کیا غرض تھی کہ اس کام میں آپکا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی جو ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے بالکل بے لوث تھی۔

مکہ سے جب آپکو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپکے پاس رکھوائی تھیں، حضرت علیؓ کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اسکو پہنچا دینا۔ دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے لیکر چلتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان کے دشمنوں، اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انہیں واپس پہنچانے کی فکر کی اور اس وقت کی جبکہ وہ اسکے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ وہ اخلاق تھا جسکو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہونگے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال بعد بدر کے میدان میں آنحضرت کے خلاف لڑنے کھڑے ہوئے ہونگے تو انکے دل اندر سے کہہ رہے ہونگے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھولتا؟ اسوقت انکے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہونگے مگر انکے دل اندر سے کھنچ رہے ہونگے۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہو۔

۱۳ برس کی شدید جدوجہد کے بعد وہ وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے آدمی فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک

اسلام کی پوری تربیت پاکر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی اسکو کام کرنیکا موقع ملے مسلمان کی حیثیت سے اسکو انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لیے تیار تھے، اچنانچہ وہ قائم کر دیا گیا۔ دس برس تک رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدت میں ہر شعبۂ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرا دی۔ یہ دور اسلامی آئیڈیالوجی کے ایک مجرد تخیل (Abstract idea) سے ترقی کر کے ایک مکمل نظام تمدن بننے کا دور ہے جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبۂ زندگی کے لیے اصول بنے، ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا، اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کیے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اسکی عملی صورت میں اور اسکے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہوتے جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اسی کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے۔ بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جسکے خلاف وہ برسوں تک لڑتے رہے تھے۔ خالد بن ولید قائل ہوئے، ابوجہل کے بیٹے عکرمہ قائل ہوئے، ابوسفیان قائل ہوئے، قاتل حمزہ وحشی قائل ہوئے، ہندہ جگر خوار تک کو آخر کار اس شخص کی صداقت کے آگے سر تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اسکی نگاہ میں کبھی کوئی مبغوض نہ تھا۔

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا زیادہ نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا۔ حالانکہ ۸ سال کی تمام لڑائیوں میں، جن سے عرب جیسی جنگجو قوم مسخر ہوئی، طرفین کے جانی نقصانات کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلابات کی تاریخ اگر آپکے پیش نظر ہے تو آپکو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ انقلاب غیر خونی انقلاب (Bloodless revolution) کہے جانے کا مستحق ہے۔ پھر اس انقلاب

میں فقط ملک کا طریق انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں، نگاہ کا زاویہ بدل گیا، سوچنے کا طریقہ بدل گیا، زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائل بدل گئے، غرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ کر دی گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے۔ جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ جو چور اور اچکے تھے اُن کا احساس دیانت اتنا نازک ہوگیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی انکو اس بنا پر تامل تھا کہ مبادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے، حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں جو ڈاکو اور لٹیرے تھے وہ اتنے متدین بن گئے کہ انکے ایک معمولی سپاہی کو پایہ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروڑوں کی قیمت کا شاہی تاج ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کمبل میں اسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالہ کرنے کے لیے پہنچا تاکہ اس غیر معمولی واقعہ سے اسکی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اسکے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آجائے۔ وہ جنکی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے، انکے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ جنکو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی انکے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب انکا تحصیلدار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اسکو منیش قرار رقم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کر دے، مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور حکومت اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیئے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھالیں۔ اس نرالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر یہودی انگشت بدنداں رہ گئے اور بے اختیار انکی زبانوں سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے

تھے، بازاروں میں پیدل پھرتے تھے، دروازوں پر دربان تک نہ رکھتے تھے، رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا اُن سے انٹرویو کر سکتا تھا۔ انکے اندر وہ قاضی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعویٰ اِس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور اپنے بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ انکے اندر وہ سپہ سالار پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دورانِ جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہکر اہلِ شہر کو واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں، لہٰذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ اُن میں وہ سفیر پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے سپہ سالار ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساواتِ انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برمحل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اِس مذہب انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اُسی وقت پڑ گیا ہوگا۔ ان میں وہ شہری پیدا ہوئے جنکے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی انکا اقبال خود آکر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انہیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں نہ پیش ہوں۔ ان میں وہ سپاہی پیدا ہوئے جو تنخواہ لیکر نہیں لڑتے تھے بلکہ اُس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے، اپنے خرچ سے میدان جنگ میں جاتے اور پھر جو مالِ غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کا سارا لاکر سپہ سالار کے سامنے رکھدیتے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذہنیت کا اتنا زبردست تغیر محض لڑائیوں کے زور سے ہو سکتا تھا؟ تاریخ آپکے سامنے موجود ہے۔ کہیں آپکو ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح مکمل طور پر بدل ڈالا ہو؟

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ۱۳ برس کی مدت میں تو کل ڈھائی تین سو مسلمان پیدا ہوئے مگر بعد کے دس سال میں سارا کا سارا ملک مسلمان ہوگیا۔ اس معمے کو لوگ حل نہیں کرسکتے اس لیے عجیب عجیب توجیہیں کرتے ہیں۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے۔ جب تک اس نئی آئیڈیالوجی پر زندگی

کا نقشہ نہیں بنا تھا، لوگوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا لیڈر آخر کیا بنانا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یہ نری شاعرانہ باتیں ہیں۔ کوئی اسے محض زبان کی ساحری قرار دیتا۔ کوئی کہتا کہ یہ شخص مجنون ہو گیا ہے۔ اور کوئی اسے محض ایک خیالی آدمی (Visionary) قرار دیکر گویا اپنے نزدیک رائے زنی کا حق ادا کر دیتا۔ اُس وقت صرف غیر معمولی سمجھ اور ذہانت رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جنکی نگاہ حقیقت بیں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نظام فکر پر ایک مکمل نظام حیات بنگیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو کام کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اسکے نتائج انکے سامنے عیاناً آگئے تب انکی سمجھ میں آیا کہ یہ وہ چیز تھی جسکو بنانے کے لیے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سہہ رہا تھا۔ اسکے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ جسکی پیشانی پر بھی دو آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں نور تھا اسکے لیے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کرنا غیر ممکن ہو گیا۔

یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جسکو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔ یہی اس کا راستہ ہے۔ اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے، اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اسکو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہدیتے ہیں کہ اب یہ کہاں ہو سکتا ہے، نبی ہی آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبیعی قسم کا واقعہ ہے۔ اس میں علت اور معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج بھی ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لیے ایمان، شعور اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوت فیصلہ، اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اس کے لیے ان جوان ہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اس پر پوری طرح نظر جما دیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں، دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے، وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک انچ نہ ہٹیں، دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات

کو قربان کردیں، اپنی امیدوں کا اور اپنے والدین کی تمناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں، عزیزوں اور دوستوں کے چھوٹ جانے کا غم نہ کریں، سوسائیٹی، حکومت، قانون، قوم، وطن جو چیز بھی انکے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اس سے لڑ جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا، ایسے ہی لوگ آج بھی کرینگے اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کیے سے ہو سکتا ہے۔

استدراک :- اوپر کے مضمون میں اسلامی انقلاب کے طریق کار کی جو توضیح کی گئی ہے، اگرچہ وہ بجائے خود کافی ہے، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسیح علیہ السلام کے چند اقوال ایک خاص ترتیب کے ساتھ نقل کر دیے جائیں جن سے اس تحریک کے ابتدائی مرحلہ پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ ہمارے موجودہ زمانے کے حالات اُن حالات سے بہت ملتے جلتے ہیں جن میں سیدنا مسیحؑ نے اہلِ فلسطین کو حکومت الٰہیہ کی دعوت دی تھی اس لیے اُنکے طریقِ عمل میں ہم کو مفید ہدایات مل سکتی ہیں :-

"فقیہوں میں سے ایک نے . . . . اُس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کونسا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے، اے اسرائیل سُن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند[1] ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ۔ . . . . . فقیہ نے اس سے کہا اے اُستاد، کیا خوب! تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں" (مرقس ۱۲ : ۲۸ - ۳۲)

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (لوقا ۴ : ۸)

"پس تم اس طرح دعا مانگا کرو کہ اے ہمارے باپ! تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے

[1] "خداوند" اور "الٰہ" دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ ۷۵

زمین پر بھی ہو" (متی ۶ : ۹ - ۱۰)

اس آیت میں حضرت مسیح نے اپنے نصب العین کو واضح کردیا ہے - یہ جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے انکی مراد محض روحانی بادشاہت تھی، یہ آیت اسکی تردید کرتی ہے - انکا صاف مقصد یہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اس کا حکم شرعی اسی طرح جاری ہو جس طرح تمام کائنات میں اسکا قانون طبیعی نافذ ہے - اسی انقلاب کے لیے وہ لوگوں کو تیار کررہے تھے -

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں - صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں - میں اسلیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اسکی ماں سے اور بہو کو اسکی ساس سے جدا کردوں - اور آدمی کے دشمن اسکے گھر ہی کے لوگ ہونگے - جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں - اور جو کوئی اپنی صلیب[1] نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں - جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئیگا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائیگا" (متی ۱۰ : ۳۴ - ۳۹)

"جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی خودی[2] سے انکار کرے اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہولے" (متی ۱۶ : ۲۴)

"بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالہ کریگا اور بیٹے کو باپ - اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہوکر انہیں مروا ڈالینگے - اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کرینگے مگر جو آخر تک برداشت کریگا وہی نجات پائیگا (متی ۱۰ : ۲۱ - ۲۲)

"دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں ..... آدمیوں سے خبردار

[1] اپنی صلیب اٹھانے سے مراد سزائے موت کے لیے تیار رہنا ہے - جسطرح اردو میں محاورہ ہے سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلنا -
[2] اس سے مراد ہے خود پرستی اور اغراض ذاتی سے دست بردار ہوجانا -

رہو کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالہ کرینگے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے مارینگے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیے جاؤگے" (متی ۱۰: ۱۶-۱۸)

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے[1] تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ ایک بُرج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کرے کہ آیا میرے پاس اسکے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر اس پر ہنسنا شروع کر دیں کہ اس شخص نے عمارت بنانی شروع تو کی مگر تیار نہ کر سکا ۔۔۔ تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کر دے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا" (لوقا ۱۴: ۲۶-۳۳)

یہ تمام آیات صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام محض ایک دھرم کا پرچار کرنے نہیں اٹھے تھے بلکہ پورے نظام تمدن و سیاست کو بدل دینا انکے پیش نظر تھا جس میں رومی سلطنت، یہودی ریاست، فقیہوں اور فریسیوں کے اقتدار، اور فی الجملہ تمام بندگانِ نفس و ہوائے نفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ لوگوں کو کھلے الفاظ میں بتا دیتے تھے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے اور میرے ساتھ اسی کو آنا چاہیے جو ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہو۔

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اسکی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا" (متی ۵: ۳۹-۴۱)

[1] دشمنی کرنے سے مراد انکی محبت اور انکے مفاد کو اسلامی تحریک پر قربان کر دینا ہے۔

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے اُن سے نہ ڈرو بلکہ اس سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔" (متی ۱۰ : ۲۸)

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو۔" (متی ۶ : ۱۹-۲۰)

کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا ...... تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے ...... اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائینگے، یا کیا پئینگے، اور نہ بدن کی کہ کیا پہنینگے ...... ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ انکو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے ان میں سے کسی کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائیگی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائیگا؟ ...... تم پہلے اُس کی بادشاہت اور اسکی راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائینگی۔" (متی ۶ : ۲۴-۳۳)

"مانگو تو تمہیں دیا جائیگا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائیگا۔" (متی ۷ : ۷)

عام غلط فہمی ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے رہبانیت اور ترک و تجرید کی تعلیم دی ہے۔ حالانکہ اس

انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحمل شدائد، اور توکل علی اللہ کی تعلیم و تربیت دیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ جہاں ایک نظام تمدن و سیاست پوری طاقت کے ساتھ زمین پر چھایا ہوا ہو اور تمام وسائل و ذرائع زندگی اسکے قبضہ و اختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی جماعت انقلاب کے لیے اٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان و مال کی محبت دل سے نکال نہ دے، سختیاں اٹھانے کو تیار نہ ہو جائے، اپنے بہت سے فوائد کو قربان کرنے اور بہت سے نقصانات کو گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حاضر الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام آفات و مصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہے۔ یہ کام جنہیں کرنا ہو انہیں ایک تھپڑ کھا کر دوسرے تھپڑ کے لیے تیار رہنا چاہیے، کرتا ہاتھ سے جاتا ہو تو چوغہ بھی چھوڑ دینے کے لیے آمادہ ہونا چاہیے، اور روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہو جانا چاہیے۔ خزائن رزق فی الوقت جنکے ہاتھ میں ہیں، ظاہر ہے کہ ان سے لڑکر رزق پانے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا جو اسباب سے قطع نظر کر کے صرف خدا کے بھروسے پر اس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو وہی ان سے لڑ سکتا ہے۔

"اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ! میں تمہیں آرام دونگا۔ میرا جُوا اپنے اوپر اٹھالو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ میرا جوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا" (متی ۱۱: ۲۸ - ۳۰)

شائد حکومت الٰہیہ کا مینی فسٹو اس سے زیادہ مختصر اور پر اثر الفاظ میں مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ انسان پر انسانی حکومت کا جُوا بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے۔ اس بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کو الٰہی حکومت کا نقیب جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس حکومت کا جُوا میں تمہارے اوپر رکھنا چاہتا ہوں، وہ نرم بھی ہے اور خفیف بھی۔

"غیر قوموں کے بادشاہ ان پر حکومت چلاتے ہیں۔ اور جو اُن پر اختیار رکھتے ہیں وہ خداوند نعمت کہلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا بلکہ جو تم میں بڑا ہے وہ چھوٹے کے مانند

اور جو سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کے مانند بنے" (لوقا ۲۲: ۲۵-۲۶)

مسیح علیہ السلام یہ ہدایت اپنے حواریوں یعنی صحابیوں کو فرماتے تھے۔ اس مضمون کے متعدد اقوال انجیلوں میں موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کہیں فرعونوں اور نمرودوں کو ہٹا کر تم خود فرعون و نمرود نہ بن جانا۔

"فقیہ اور فریسی[1] موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں، پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جنکا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انہیں اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں۔ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربی کہلانا پسند کرتے ہیں۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو، نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔"

"اے اندھے راہ بتانے والو! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے

[1] فریسی سے مراد حاملانِ شریعت ہیں۔

مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو" (متی ۲۳: ۲ - ۲۸)

یہ اُس وقت کے حاملانِ شریعت کا حال تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود محض بندگیٔ نفس کی وجہ سے آپ بھی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے اور اس انقلاب کے راستہ میں رومی قیاصرہ سے بڑھ کر وہی حائل تھے۔

"اُس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔ پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں[1] کے ساتھ اسکے پاس بھیجا اور انہوں نے (یعنی شاگردوں نے) کہا کہ اے استاد! ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا۔۔۔۔ ہمیں بتا تو کیا سمجھتا ہے قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے انکی شرارت جان کر کہا اے ریاکارو! مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکہ مجھے دکھاؤ۔ وہ ایک دینار اسکے پاس لے آئے۔ اس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انہوں نے کہا قیصر کا۔ اس پر اس نے کہا پس جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو" (متی ۲۲: ۱۵ - ۲۱)

اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل ایک چال تھی۔ فریسی اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے چاہتے تھے کہ حضرت مسیح کا قبل از وقت حکومت سے تصادم کرا دیا جائے اور تحریک کے جڑ پکڑنے سے پہلے حکومت کے زور سے اسکو کچلوا ڈالا جائے۔ اسی لیے ہیرودی ریاست کی سی آئی ڈی کے سامنے

[1] مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں فلسطین کے ایک حصہ میں ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی طرح ایک یہودی ریاست قائم تھی جو سلطنت روم کی تابع فرمان تھی۔ اسکے بانی ہیرود کے نام پر اسکو عموماً ہیرودی ریاست کہتے تھے۔ ہیرودیوں سے مراد اس ریاست کی پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی ہیں۔

سوال اٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جائے یا نہیں۔ جواب میں حضرت مسیح نے جو ذومعنی بات کہی اسکو دو ہزار برس سے مسیحی اور غیر مسیحی سب اس معنی میں لے رہے ہیں کہ عبادت خدا کی کرو اور اطاعت ہر اُس حکومت کی کرتے رہو جو تمہارے زمانے میں موجود ہو۔ لیکن دراصل مسیح علیہ السلام نے نہ تو یہ فرمایا کہ قیصر کو ٹیکس دینا روا ہے، کیونکہ ایسا کہنا اُنکی دعوت کے خلاف تھا اور نہ یہ فرمایا کہ اسے ٹیکس نہ دیا جائے، کیونکہ اس وقت تک اُن کی تحریک اس مرحلہ پر نہیں پہنچی تھی کہ ٹیکس روکنے کا حکم دیا جاتا، اسلیے انہوں نے یہ لطیف بات کہہ دی کہ قیصر کا نام اور اس کی صورت تو قیصر ہی کو واپس کر دو، اور سونا جو خدا نے پیدا کیا ہے وہ خدا کی راہ میں صرف کرو۔

اس سازش میں ناکام ہونے کے بعد فریسیوں نے خود مسیح کے حواریوں میں سے ایک کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کسی ایسے موقع پر مسیح کو گرفتار کرائے جبکہ عام بلوے کا خطرہ نہ ہو۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور یہوداہ اسکریوتی نے مسیح کو پکڑوا دیا۔

"پھر ان کی ساری جماعت اٹھ کر اسے پیلاطُس (رومی حاکم) کے پاس لے گئی اور انہوں نے اس پر الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا۔ ..... پیلاطس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا کہ میں اس شخص میں کچھ قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لیکر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر ابھارتا ہے .... وہ چلّا چلّا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے اور ان کا چلّانا کارگر ہوا" (لوقا ۲۳: ۱-۲۳)

اس طرح دنیا میں مسیح علیہ السلام کا مشن اُن لوگوں کی بدولت ختم ہوا جو اپنے آپ کو

حضرت موسیٰؑ کا وارث کہتے تھے۔ تاریخی شواہد کی رو سے حضرت مسیح کی نبوت کا کل زمانہ ڈیڑھ سال اور تین سال کے درمیان رہا ہے۔ اس مختصر مدت میں انہوں نے اتنا ہی کام کیا جتنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مکی زندگی کے ابتدائی دو تین سال میں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص انجیل کی مذکورۂ بالا عبارات کا مقابلہ قرآن مجید کی مکی سورتوں اور زمانۂ قیام مکہ کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائیگا۔

جماعتِ اسلامی کی تشکیل

جو کچھ عرض کیا جاچکا ہے اُس سے تین حقیقتیں پوری طرح واضح ہو جاتی ہیں:

ایک یہ کہ اسلام کا مقصد زندگی کے فاسد نظام کو بالکل بنیادی طور پر بدل دینا ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ کلی و اساسی تغیر صرف اُسی طریق پر ممکن ہے جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا تھا۔

تیسرے یہ کہ مسلمانوں میں اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جو کچھ اب ہو رہا ہے وہ نہ اس مقصد کے لیے ہے اور نہ اس طریقہ پر ہے۔

اس توضیح کے بعد بلا کسی تمہید کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو صحیح معنوں میں "جماعت اسلامی" ہو اور اسلامی نصب العین کے لیے اسلامی طریق پر کام کرے۔

ایسی ایک جماعت کی تشکیل کس طرح ہو اور اُس کا ابتدائی پروگرام کیا ہو؟ ان دونوں سوالات پر بھی میں گذشتہ صفحات میں کافی روشنی ڈال چکا ہوں۔ خصوصاً میرا مضمون "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" تو انہی دو سوالوں کے جواب پر مشتمل ہے۔ لیکن عام طور پر دماغ ان چیزوں سے اس قدر اجنبی

ہو چکے ہیں کہ سب کچھ سننے کے بعد کہتے ہیں "پروگرام لاؤ"، گویا جو کچھ کہا گیا ہے اُس میں تو کوئی پروگرام تھا ہی نہیں اسلیے یہاں جماعتِ اسلامی کے طریق تشکیل کو پوری طرح کھول کر دفعہ وار بیان کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد اگر موجودہ پارٹیوں میں سے کوئی پارٹی اپنے دستور العمل اور پروگرام کو اس نقشہ کے مطابق تبدیل کرنے تو نہایت خوشی کی بات ہوگی، ورنہ ایک نئی جماعت بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں:

(۱) جماعت اسلامی میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہوگا۔ اسی طرح کوئی شخص کلمۂ طیبہ کے الفاظ کو بے سمجھے بوجھے محض زبان سے ادا کر کے بھی اس جماعت میں نہیں آسکتا۔ اس دائرے میں آنے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمۂ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو، وہ جانتا ہو کہ اس کلمہ میں نفی کس چیز کی ہے اور اثبات کس چیز کا، اور اس نفی و اثبات کی شہادت دینے سے اُس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اور یہ شہادت اُسکے طرزِ خیال وطرزِ زندگی میں کس قسم کے تغیر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ کہنے کی جرأت کرے صرف وہی جماعت اسلامی میں داخل ہو سکتا ہے، خواہ وہ پیدائشی غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے، یا پیدائشی مسلمان ہو اور از سرِ نو ایمان لائے۔

پیدائشی مسلمانوں کے کسی بڑے مجمع میں جوشیلی تقریر کے بعد لوگوں سے شہادت کا مطالبہ کرنا صحیح طریقہ نہیں ہے، کیونکہ دین آبائی سے جو روایتی دلچسپی اُنکے اندر موجود ہے اسکی بنا پر وہ کسی احساس ذمہ داری کے بغیر بلا تامل کلمہ پڑھ دینگے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ فرداً فرداً اُنکے سامنے کلمہ کے مفہوم کو اسکی ذمہ داریوں اور مقتضیات کے ساتھ پیش کیا جائے، اور جب وہ سوچ سمجھ کر شہادت ادا کریں تب انہیں جماعت میں داخل کیا جائے۔

کلمۂ شہادت کے سوا اس جماعت میں داخل ہونے کے لیے کوئی داخلہ کی فیس یا رکنیت کی فیس نہیں ہے۔

(۲) ادائے شہادت کے بعد فوری تغیر جو ایک شخص کو اپنی زندگی میں کرنا ہوگا وہ یہ ہے:

(الف) فرائض کو ان کی شرعی پابندیوں کے ساتھ ادا کرے،

(ب) کبائر سے اجتناب کرے اور اگر نادانستہ کسی کبیرہ کا مرتکب ہو جائے تو اس سے توبہ کرے،

(ج) اگر وہ کوئی ایسا ذریعۂ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کی تعریف میں آتا ہے، مثلاً سود، شراب، زنا، رقص و سرود، شہادت زور، رشوت، خیانت، قمار، قتال فی غیر سبیل اللہ وغیرہ تو اسکو ترک کر دے بلا اس لحاظ کے کہ اسکے ترک کرنے میں کتنا ہی نقصان ہو، اور اگر اسکی معاش میں ان وسائل کا کوئی حصہ ہو تو وہ اس حصہ سے اپنی معیشت کو پاک کرے،

(د) اگر اسکے قبضہ میں ایسا مال (یا جائداد) ہو جو حرام طریقہ سے آیا ہو یا جس میں حق داروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے فوراً دست بردار ہو جائے اور اہل حقوق کو انکے حق پہنچا دے،

(ھ) اگر وہ کسی مجلس قانون ساز کا رکن ہو تو اس سے مستعفی ہو جائے کیونکہ قانون سازی صرف خدا کا منصب ہے اور انسان کا قانون ساز بننا خدائی کے دعوے کو متضمن ہے۔

(و) اگر وہ کسی غیر الٰہی نظام کی طرف سے خطاب رکھتا ہو تو اسکو واپس کر دے اور اُن وفاداریوں اور نیازمندیوں سے باز آئے جنکی بدولت اس نے خطاب پایا تھا، یا جنکو اب خطاب یافتہ ہونے کی وجہ سے نباھنا پڑتا ہے۔

(ز) کسی غیر الٰہی نظام عدالت میں اپنا مقدمہ نہ لے جائے خواہ اس پابندی سے اسکو کتنا ہی ضرر پہنچتا ہو (البتہ اگر کوئی دوسرا شخص اسکو کسی مقدمہ میں گھسیٹ لے تو جائز طریقہ سے اپنی مدافعت کر سکتا ہے نہ اس حیثیت سے کہ یہ نظام عدالت برحق ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ جب بندہ اس پر حملہ آور ہوا ہے تو اسے دفع کرنا ہے)

یہ تغیرات جس شخص کی زندگی میں فوراً رونما نہ ہوں اسکے متعلق یہ سمجھا جائیگا کہ وہ کلمۂ شہادت ادا کرنے میں صادق نہ تھا اور اس بنا پر وہ جماعت میں نہ لیا جائیگا یا لیا جا چکا ہے تو خارج کیا جائیگا۔

(۳) ادائے شہادت کے بعد بتدریج جو تغیرات ہر شخص کو اپنی زندگی میں کرنے ہونگے وہ یہ ہیں:

(الف) دین کا کم از کم اتنا علم حاصل کر لینا کہ اسلام اور جاہلیت کا فرق معلوم ہو اور حدود اللہ سے واقفیت حاصل ہو جائے

(ب) تمام معاملات میں اپنے نقطۂ نظر، طرزِ خیال اور طرزِ عمل کو ہدایت الٰہی کے مطابق ڈھالنا، اپنی زندگی کے مقصد، اپنی پسند اور قدر کے معیار، اور اپنی وفاداریوں کے محور کو تبدیل کر کے رضائے الٰہی کے موافق بنانا، اور اپنی خود سری و نفس پرستی کے بت کو توڑ کر تابع امر رب بن جانا، (ج) اُن تمام رسوم جاہلیت سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف ہوں، (د) تمام اُن تعصبات اور دلچسپیوں سے اپنے قلب کو، اور اُن مشاغل اور جھگڑوں اور بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جنکی بنا نفسانیت یا دنیا پرستی پر ہو اور جنکی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو،

(ھ) فاسقین فجار اور خدا سے غافل لوگوں سے ربط و تعلق توڑنا اور صالحین سے ربط قائم کرنا، (و) اُن تمام اداروں سے تعلق منقطع کرنا جو جاہلیت کی خدمت کرتے ہوں اور جنکا مقصد حاکمیت رب العالمین کے قیام و اثبات کے سوا کچھ اور ہو، (ایسے اداروں کے ساتھ وقتی ضروریات کے لحاظ سے تعاون یا صلح و معاہدت کے معاملات کیے جا سکتے ہیں، مگر یہ افراد کا کام نہیں جماعت کا کام ہے۔ کوئی مسلمان انفرادی طور پر ایسے کسی ادارے کا جزء نہیں بن سکتا)

(ز) اپنے معاملات کو راستی، عدل، خدا ترسی، اور بے لاگ حق پرستی پر قائم کرنا، (ح) اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو قیام دین حق کے نصب العین پر مرتکز کر دینا اور اپنی ضروریات زندگی کے ماسوا اُن تمام مصروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں۔

ضروری نہیں کہ یہ تغیرات تمام اشخاص میں کمال درجہ پر ہوں، مگر ہر شخص کو اس باب میں اپنی تکمیل کی کوشش کرنی ہوگی کیونکہ انہی تغیرات کے اعتبار سے ناقص یا کامل ہونے پر جماعت اسلامی میں آدمی کے مرتبے کا تعین ہوگا۔

(۴) جو لوگ غیر الٰہی نظام حکومت کو چلانے میں کالی حیثیت سے کام کرتے ہیں یا غیر الٰہی قانون کے اجراء میں مددگار بنتے ہیں انکی تین حیثیتیں ہیں:

اگر وہ اپنے اس کام پر خوش اور مطمئن ہیں اور اپنے اس کسب کو حلال و طیب سمجھتے ہیں اور اسی راہ میں ترقی

درجات کے متمنی ہیں تو اُنکے لیے اس دائرے میں کوئی جگہ نہیں۔

اگر وہ اس نظام کو غلط اور اپنے کسب کو حرام سمجھتے ہیں، مگر اعتراف گناہ کے باوجود اسکو محض ضعفِ ایمانی کی وجہ سے ترک نہیں کر سکتے تو وہ جماعت اسلامی کے طبقہ سوم میں (جسکی تشریح آگے آتی ہے) داخل ہو سکتے ہیں۔

اگر وہ محض اس مجبوری سے اس نظام میں منسلک رہیں کہ کوئی دوسرا ذریعۂ زندگی نہیں پاتے، اور نیک نیتی کے ساتھ اس بات کے لیے تیار ہوں کہ دوسرا ذریعہ پاتے ہی اسے ترک کر دینگے تو وہ جماعت اسلامی کے درجہ دوم میں (جسکی تشریح آگے آتی ہے) داخل ہو سکتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ غیر الٰہی نظام اطاعت کے ایک جز اور دوسرے جز میں کوئی فرق نہیں۔ اسکے جو اجزا بظاہر بالکل معصوم نظر آتے ہیں وہ بھی اُسی قدر ناپاک ہیں جسقدر دوسرے غیر معصوم اجزاء۔ نیز جو غیر الٰہی نظام اطاعت مسلمانوں کی خداوندی میں چل رہا ہو وہ بھی اپنے تمام اجزاء سمیت اسی حکم میں ہے۔ مسلمان کی خداوندی اُسکو ہرگز کوئی سندِ طہارت عطا نہیں کرتی۔

(۵) جہاں ایک شخص متذکرہ صدر طریقہ پر ایمان لائے، اسکے لیے لازم ہے کہ ایک طرف اپنے حلقۂ تعارف میں دوسرے مردوں اور عورتوں کو دعوتِ ایمان دے، اور دوسری طرف اپنی بستی میں ان لوگوں کو تلاش کرے جو اسکی طرح ایمان لائے ہوں۔ پھر جہاں ایسے دو آدمی بھی مجتمع ہیں وہاں انکو عارضی طور پر جماعتی ہیئت بنا لینی چاہیے، اس نیت کے ساتھ کہ جب بڑی جماعت بننے کی نوبت آئے یا انکو معلوم ہو کہ مرکزی جماعت بن گئی ہے تو وہ بلا تامل اس میں شامل ہو جائیں۔ (اس قسم کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کا اپنی مستقل امارتوں کے جھنڈے بلند کرنا اور اپنے علٰحدہ وجود کو باقی رکھنے پر اصرار کرنا انکے صدقِ ایمانی کا نہیں بلکہ انکی نفسانیت کا ثبوت ہوگا)

(۶) جو لوگ نظام جماعت میں شامل ہوں انکو انکے حالات کے لحاظ سے ابتداءً تین طبقوں میں منقسم کیا جائیگا:

ا۔ ایسے اشخاص جو تن من دھن سے جماعت میں شریک ہوں، جو اسلامی نصب العین کے حصول کی جد و جہد میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں، جو اپنے آپکو بلا کسی استحفاظ و استثناء کے اس طرح جماعت کے حوالہ کریں کہ جب انکو پکارا جائے لبیک کہیں، جو خدمت انکے سپرد کی جائے انجام دیں، اور جان، مال، اولاد، عزیز، اقارب، دوست غرض کسی چیز کو بھی مقصدِ اسلامی سے

زیادہ عزیز نہ رکھیں، وہ صفِ اول کے لوگ ہونگے، جماعت کا اصل کارکن کارفرما عنصر وہی ہونگے، اور رہنمائی و سربراہ کاری انہی کے ہاتھ میں ہوگی۔

وہ لوگ جو اپنے آپکو بالکلیہ وقف کرنیکی طاقت نہ رکھتے ہوں اور نہ خطرات اور قربانیوں کا پورا بار اٹھا سکتے ہوں، مگر اپنے وقت اپنے مال اور اپنی قوتوں کا ایک حصہ اپنے نفس کی خدمت سے بچا کر راہِ خدا میں دینے کے لیے تیار رہیں، وہ طبقۂ دوم میں شمار ہونگے بشرطیکہ اپنی شخصی زندگی کی حد تک احکام دین کی پوری اطاعت کریں، اُن وسائل کسبِ رزق اور اُن مشاغل سے مجتنب رہیں جو براہِ راست دینِ حق کے خلاف ہیں، اور صدق دل سے جماعت اسلامی کے خیرخواہ و وفادار ہوں۔ جماعت کیطرف سے انکے سپرد وہی خدمات کی جائینگی جنکو وہ خود بخوشی قبول کریں۔ ذمہ داری کا کوئی منصب انکے سپرد نہ کیا جائیگا۔ اور جماعتی مشوروں میں شریک ہو سکینگے۔

جو لوگ کلمۂ اسلام پر اصولی حیثیت سے ایمان لائیں اور شخصی زندگی کی حد تک احکام شرعی کی پابندی بھی قبول کریں، مگر غیر الٰہی نظام سے انکے جو مفاد وابستہ ہیں اُنکا نقصان گوارا نہ کر سکیں وہ طبقۂ سوم میں داخل ہونگے اور انکا شمار صرف ہمدردوں میں ہوگا۔ بشرطیکہ وہ دوسری وفاداریوں پر خدا کی وفاداری کو مقدم رکھیں، غیر الٰہی نظام میں ترقی درجات کے لیے کوشاں ہوں، اور جماعت اسلامی کو ہر جائز امکانی طریقہ سے مدد دیں۔ جماعتی مشوروں میں وہ صرف اُس حد تک شریک ہو سکتے ہیں جس حد تک جماعت کو انکے خلوص پر اعتماد ہو۔

طبقات کی یہ تقسیم تمام اشخاص کے حق میں دائمی و ابدی نہ ہوگی بلکہ شخصی حالات کے تغیر و تبدل کے ساتھ بدلتی رہیگی۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی طبقۂ سوم کے ایک شخص کی حالت بدل جائے اور وہ طبقۂ اول میں آجائے اور علیٰ ھذا القیاس اسکے برعکس۔

(۷) اس جماعت کا ابتدائی پروگرام اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایکطرف اس میں شامل ہونے والے افراد اپنے نفس اور اپنی زندگی کا تزکیہ کریں، اور دوسری طرف جماعت سے باہر جو لوگ ہیں (خواہ وہ قومی مسلمان ہوں یا غیر مسلم) انکو بالعموم حاکمیت غیر اللہ کا انکار کرنے اور حاکمیت رب العالمین کو تسلیم کرنیکی دعوت دیں۔ اس دعوت کی راہ میں جب تک کوئی قوت حائل نہ ہو، اُنکو بھی اس سے چھیڑ چھاڑ کی ضرورت نہیں۔ اور جب کوئی قوت حائل ہو، خواہ وہ کوئی قوت ہو، تو ان کو اس کے علی الرغم اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرنی ہوگی اور اس تبلیغ میں جو مصائب بھی پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔

بعد کے مراحل کے متعلق اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جیسے حالات پیش آئینگے انہی کے لحاظ سے قدم اٹھایا جائیگا۔ البتہ لوگوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مضبوط جمے ہوئے اور زمین پر چھائے ہوئے دین کو اکھاڑ کر دوسرے دین کو قائم کرنا بہر حال آسان کام نہیں ہے۔ اس میں جان، مال اور ہر چیز کا زیاں ہے، لہٰذا وہی لوگ آگے بڑھیں جو تمام فائدوں اور آسائشوں کی قربانی اور تمام نقصانات کی برداشت کے لیے تیار ہوں۔

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید' ہدایت و ضلالت' عبادت' جہاد' آزادی' رواداری' قومیت اسلامی' عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا' رسول کی صحیح حیثیت' رسالت محمدی کا نمونہ عملی' شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق' منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بےجلد ایکروپیہ آٹھ آنے قیمت مجلد دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۰۴۲ صفحات۔ قیمت غیر مجلد -/۴/۱ مجلد -/۸/۱ محصولڈاک -/۴/-



الجہاد فی الاسلام

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

دورِ جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ بھی حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروجِ اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدھا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈسنا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کر دیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر یہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ یہ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلوار بند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحّص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروعِ اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بےجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

اپریل

Registered No. L. 4186

جلد ۱۸ — عدد ۲

صفر ۱۳۶۰ھ

۷۸٦

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک ۔ پونچھ روڈ ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ۸؍

قیمت سالانہ ۵؍

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بجلد ایک روپیہ آٹھ آنے قیمت مجلد دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد -/۴/۱ مجلد -/۸/۱ محصولڈاک -/۴/-

فہرست مضامین

ماہ صفر ۱۳۶۰ھ (مطابق اپریل ۱۹۴۱ء) جلد ۱۸ - عدد ۲

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس بکر روڈ میں طبع ہو کر
دفتر ترجمان القرآن پونچھ روڈ۔ مبارک پارک لاہور سے شائع ہوا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اشارات

دنیا میں اس وقت بڑے زور کے ساتھ توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے۔ یہ ہم نہیں جانتے کہ أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَنْ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا، اہل زمین کو محض انکے کرتوتوں کی سزا ہی دینے کا ارادہ کیا گیا ہے یا اس توڑ پھوڑ کے بعد کوئی صالح چیز بھی بننے والی ہے، مگر ظاہر آثار سے اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ نوع انسانی کی امامت اب تک جس تہذیب کے علمبرداروں کو حاصل رہی ہے، اسکی عمر پوری ہو چکی ہے، اُن کے امتحان کا زمانہ خاتمہ پر آلگا ہے، اور سنت اللہ کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ انکو اور انکی اس جاہلی تہذیب کو دنیا کے انتظام سے بے دخل کر دیا جائے انکو زمین پر کام کرنے کا جتنا موقع ملنا تھا، مل چکا۔ وہ اپنے تمام اوصاف، اور اپنی تمام چھپی ہوئی قابلیتوں کا پورا پورا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ اُنکے اندر شاید اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی ہے جو باہر نہ آچکی ہو۔ لہذا غالب گمان یہی ہے کہ عنقریب وہ میدان سے ہٹائے جانے والے ہیں، اور یہ زبردست شکست و ریخت اسی لیے ہو رہی ہے کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مراسم تجہیز و تدفین ادا کر دیں۔ اسکے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا میں پھر ایک ظلمت کا دور شروع ہو جس طرح آخری اسلامی تحریک کے زوال اور موجودہ جاہلی تہذیب کی پیدائش کے درمیان گذر چکا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی ٹوٹ پھوٹ کے دوران میں کسی نئی تعمیر کی صورت نکل آئے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت، قومی اجتماعیت (نیشنل سوشلزم) اور اشتراکیت (کمیونزم) کی جو طاقتیں اس وقت آپس میں متصادم ہیں، یہ دراصل الگ الگ تہذیبیں نہیں ہیں کہ انکے درمیان انتخاب، اور ان میں سے بہتر کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہو۔ حقیقت میں یہ ایک ہی تہذیب کی تین شاخیں ہیں۔ ایک ہی تصور انسان، ایک ہی تصور کائنات، ایک ہی نظریۂ حیات اور ایک ہی اساس اخلاق ہے جس پر ان تینوں کی تعمیر ہوئی ہے۔ انسان کو حیوان سمجھنا، دنیا کو بے خدا فرض کرنا، علوم طبیعی سے انسانی زندگی کا قانون اخذ کرنا، اور اخلاق کی بنا تجربہ و مصلحت پر رکھنا، یہ ان سب کی مشترک بنیادیں ہیں۔ ان کے درمیان فرق صرف اس حیثیت سے ہے کہ اس جاہلی تہذیب نے سب سے پہلے فرد کی آزادی اور قوموں کی انفرادیت کا بیج بویا تھا جس سے قومی ریاستوں کے ساتھ سرمایہ دارانہ جمہوریت پیدا ہوئی اور مدتہائے دراز تک انسانیت کو تباہ و برباد کرتی رہی، پھر جب اس کے ظلم و ستم سے انسانی مصائب حد کو پہنچ گئے تو اسی تہذیب نے اشتراکی انقلاب کو بطور علاج پیش کیا، مگر بہت جلدی ظاہر ہو گیا کہ یہ علاج اصل مرض سے بھی زیادہ تباہ کن ہے، آخر کار وہی تہذیب پھر ایک دوسری تجویز سامنے لائی جس کا نام فاشزم یا نیشنل سوشلزم ہے اور چند سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اس ام الخبائث کا یہ آخری بچہ فتنہ انگیزی و شرر باری میں پہلے دونوں برخورداروں سے بھی بازی لے گیا ہے۔

اب دنیا کے لیے اُس تہذیب کو اور زیادہ آزمانے کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے جو آدمی کو جانور سمجھ کر، اور اس جانور کو بے لگام فرض کر کے اپنا کام شروع کرتی ہے اور اسکے اندر جوع البقر سے لیکر بدترین قسم کی درندگی تک ہر وہ بیماری پیدا کر دیتی ہے جو آدمیت کے حق میں نہایت مہلک ہے۔ درحقیقت یہ پوری تہذیب اپنی تمام شاخوں سمیت عمر طبعی کو پہنچ چکی ہے، امتحان کی مدت ختم کر چکی ہے، اس کے پاس اب کوئی اور انجھر ایسا باقی نہیں رہا ہے جس کو یہ انسانی مسائل کے حل کی حیثیت سے پیش کر سکے، اور بالفرض اگر یہ اپنی زندگی کی مہلت بڑھانے کے لیے کسی اور "ازم" کی تخلیق کا بہانہ کرے بھی تو خدا کی مشیت

یہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اسے اپنی زمین کو فساد سے بھرنے کا کوئی اور موقع دیگا۔ بہت ممکن ہے کہ موجودہ تصادم کے بعد اسکی شاخوں میں سے کوئی ایک شاخ باقی رہ جائے مگر یقیناً اُس کا بقا عارضی ہوگا، جلدی ہی وہ شاخ خود چیخ کر اپنے اندر سے آگ جھاڑیگی اور آپ اپنی آگ ہی سے جل کر خاک ہو جائیگی۔

اب رہا یہ سوال کہ آیا اس تہذیب کی تباہی کے بعد دنیا میں پھر کوئی ظلمت کا دور آنا ہے یا کوئی نئی تعمیر شروع ہونی ہے، تو اس کا فیصلہ دو چیزوں پر منحصر ہے:

ایک یہ کہ جاہلیت خالصہ کی ناکامی کے بعد کوئی اور ایسا نظریہ انسان کو ملتا ہے یا نہیں جو پچھلے فاسد نظریوں سے بہتر ہو، جس سے انسانی عقل صلاح کی توقعات وابستہ کر سکے اور جس پر ایک جاندار اور طاقتور تہذیب قائم ہو سکتی ہو۔

دوسرے یہ کہ نوع انسانی میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جسکے اندر جہاد اور اجتہاد کی وہ صلاحیتیں اور قوتیں ہوں جو ایک نئے نظریہ پر ایک نئی تہذیب کا قصر تعمیر کرنے کے لیے ضروری ہیں، اور جسکے اخلاق و اوصاف اُن لوگوں سے مختلف ہوں جنکی خیانت و شرارت کا ابھی قریب ہی میں انسان کو تجربہ ہو چکا ہے۔

اگر ایسا کوئی نظریہ بروقت سامنے آجائے اور اسکو لے کر ایک صالح جماعت اٹھ کھڑی ہو تو یقیناً نوع انسانی ایک دوسرے دور ظلمت سے بچ سکتی ہے، ورنہ کوئی قوت اسکو اس تاریک گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی۔ یہ صدمۂ عظیم جس سے انسانیت اس وقت دوچار ہے، یہ بھیڑیوں سے بدتر سلوک جو اس وقت آدمی آدمی کے ساتھ کر رہا ہے، یہ بے دردی و سنگدلی جو کبھی دور وحشت میں بھی آدمی سے ظاہر نہیں ہوئی تھی، یہ بے رحمی و قساوت جسکی نظیر درندہ جانور بھی پیش کرنے سے عاجز ہیں، یہ علم و حکمت کے نتائج جو آج جہاں سوز طیاروں اور انسان پاش ٹینکوں کی شکل میں دیکھے جا رہے ہیں، یہ تنظیمی قابلیتوں کے ثمرات جنہوں نے آج غارت گر فوجوں کی صورت اختیار کی ہے، یہ صنعتی ترقی کے پھل جو آج آلات جنگ کی

بھیانک شکل میں نمودار ہو رہے ہیں، یہ وسائل نشر و اشاعت کا کمال جس سے آج دنیا میں جھوٹ پھیلانے اور قوموں میں منافرت کے بیج بونے کا کام لیا جا رہا ہے، یہ سب کچھ انسان کا دل توڑ دینے اور اسکو اپنے آپ سے اور اپنی ساری قابلیتوں اور صلاحیتوں سے مایوس کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے، اور اس کا فطری نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ نوع انسانی دل شکستہ و مایوس ہو کر صدیوں کے لیے نیند اور بے ہوشی کی حالت میں مبتلا ہو جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں، انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور ایک صالح جماعت کا برسرکار آنا ہے۔

مگر وہ کونسا نظریہ ہو سکتا ہے جس کے لیے آج کامیابی کا کوئی موقع ہو؟

مشرکانہ جاہلیت جس پر دنیا کی بہت سی قدیم تہذیبیں قائم ہوئی تھیں، اب اسکے احیاء کا کوئی امکان نہیں۔ شرک کی جڑ کٹ چکی ہے۔ جاہل عوام پر چاہے اس کا تسلط ابھی باقی ہو، مگر علم و عقل رکھنے والے لوگ اب اس وہم میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ کائنات کے نظام کو بہت سے خدا چلا رہے ہیں، اور انسان کی فلاح و سعادت کا سر رشتہ دیوتاؤں یا روحوں سے وابستہ ہے۔ علاوہ بریں یہ حقیقت ہے کہ مشرکانہ نظریہ سے انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ پیچیدگیاں کچھ اور بڑھ جاتی ہیں۔ سب سے بڑی مشکل جس نے اس وقت دنیا کو پریشان کر رکھا ہے، نوع انسانی میں وحدت کا فقدان ہے۔ مگر شرک اس مشکل کو حل نہیں کرتا، بلکہ وحدت پیدا کرنے کے بجائے مزید تفریق و تقسیم کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا کسی مشرکانہ نظریہ کے لیے آج دنیا میں برسراقتدار آنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

راہبانہ جاہلیت دنیا میں کبھی کوئی طاقت نہ تھی نہ بن سکتی ہے۔ کرما اور تناسخ اور راھنسا اور ہمہ اوست کے نظریات، جو روح کو سرد اور ہمتوں کو پست اور قوائے فکریہ کو افیون تخیل کی پینک میں مست

کر دینے والے ہیں، اپنے اندر اتنی جان ہی نہیں رکھتے کہ ان کے بل پر کوئی ایسی تہذیب پیدا ہو سکے جو زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہو اور دنیا کی امامت و پیشوائی کے منصب جلیل پر فائز ہو سکتی ہو۔ کوئی سامری اس تنِ مردہ میں روح پھونکنے کی جتنی چاہے کوشش کر دیکھے، یہ نظریات کبھی گیان اور تیاگ اور تپسیا کے مقام سے آگے بڑھ کر ایک صالح تمدن کی تخلیق اور ایک عادل مملکت کی تاسیس اور ایک درخشاں تہذیب کی تعمیر تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہٰذا مردہ اور رو بزوال قومیں تو ان نظریات کے چکر میں پڑی رہ سکتی ہیں مگر کسی زندہ اور ابھرنے والی قوم کے تخیل کو یہ کبھی اپنی طرف نہیں کھینچ سکیں گے۔

رہی جاہلیت خالصہ تو اس کا اور اس کی پیداوار کا اب دنیا کو اتنا کافی تجربہ ہو چکا ہے کہ عنقریب وہ اس سے مایوس ہونے والی ہے۔ انسان کا اپنے آپ کو جانور فرض کرنا، جانوروں کی زندگی سے تنازع للبقاء اور انتخاب طبعی اور بقائے اصلح کا قانون اپنے لیے اخذ کرنا، مادّی فوائد اور لذتوں کو مقصودِ حیات ٹھیرانا، تجربات اور مصالح کو اخلاق کا ماخذ قرار دینا، اور کسی فوق الانسانی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم نہ کرنا، جو کچھ نتائج پیدا کر سکتا تھا وہ سب اپنی تمام تلخیوں کے ساتھ سامنے آ چکے ہیں۔ ان نظریات کی بدولت انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ قومی اور نسلی تعصبات ہیں، رنگ و نسل کی برتری کے دعوے ہیں، قومی ریاستوں کی معاشی و سیاسی رقابتیں ہیں، قیصریت اور استعمار اور معاشی لوٹ کے فتنے ہیں، افراد سے لیکر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں تک کا اپنے معاملات میں ہر اخلاقی قید سے آزاد ہو جانا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کا واقعی جانور بنکر کام کرنا اور دوسرے انسانوں کے ساتھ جانوروں کا سا بلکہ بے روح مشینوں کا سا سلوک کرنا ہے۔ یہ نظریات اگر جمہوریت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو ظلم اور کسب حرام اور فحش اور بے حیائی کی آزادی ملتی ہے۔ اور اگر اشتراکیت یا اجتماعیت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو بھیڑ بکریوں کے گلّے کی طرح ایک ڈکٹیٹر یا ایک چھوٹی سی پارٹی کے حوالہ کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ انہیں جس طرح چاہے ہانکے اور ان کا جو کچھ چاہے بنائے۔ یہ پھل جو ان نظریات سے پیدا ہوئے

ہوئے ہیں، کسی اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اس شجر خبیث کی عین فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے یہ پھل پیدا ہوں۔ لہذا جس طرح اب تک انسان اس سے کسی قسم کی فلاح نہیں پا سکا ہے اسی طرح آئندہ بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انسانیت کے اس حیوانی تصور اور کائنات کے اس مادہ پرستانہ نظریے اور اخلاق کی اس تجربی اور مصلحت پرستانہ بنیاد پر کوئی ایسا اجتماعی مسلک پیدا ہو سکے گا جو انسان کے لیے موجب فلاح ہو۔

ان سب نظریات کی ناکامی کے بعد اب دنیا اگر کسی نظریہ سے فلاح کی امیدیں وابستہ کر سکتی ہے تو وہ صرف ایک ایسا نظریہ ہی ہو سکتا ہے:

جو انسان کو انسان قرار دے نہ کہ جانور، جو اپنی ذات کے متعلق انسان کی رائے کو بہتر بنائے، جس کا تصور انسانیت مغربی سائنس کے "تصور حیوانی"، اور مسیحیت کے "پیدائشی گنہگار" اور ہندویت کے "مجبور تناسخ" سے بلند تر ہو۔

جو انسان کو مختار مطلق اور شتر بے مہار نہ بنائے بلکہ اسے سلطان کائنات کے اقتدار اعلیٰ کا تابع قرار دے اور اس کے آگے ذمہ دار و جواب دہ ٹھیرائے،

جو اخلاق کے ایک ایسے قابل عمل ضابطہ کا انسان کو پابند بنائے جس میں اپنی خواہشات کے مطابق رد و بدل کرنے کا حق اس کو نہ ہو،

جو مادی بنیادوں پر انسانیت کو تقسیم کرنے کے بجائے ایک ایسی اخلاقی و روحانی بنیاد فراہم کرے جس پر انسانیت متحد ہو سکتی ہو،

جو اجتماعی زندگی کے لیے ایسے اصول انسان کو دے جن پر افراد اور جماعتوں اور قوموں کے درمیان صحیح اور متوازن عدل قائم ہو سکے،

جو زندگی کے نفس پرستانہ مقاصد سے بلند تر مقاصد اور قدر و قیمت کے مادّہ پرستانہ معیاروں سے بہتر معیار انسان کو دے،

اور ان سب خصوصیات کے ساتھ، جو علمی و عقلی اور تمدنی ارتقاء میں انسان کی صرف مدد ہی نہ کرے بلکہ صحیح رہنمائی بھی کرے اور مادی و اخلاقی ہر دو حیثیتوں سے اسکو ترقی کی طرف لے جائے۔

ایسا ایک نظریہ دنیا میں اسلام کے سوا اور کونسا ہے؟ لہذا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے کہ اب انسانیت کا مستقبل اسلام پر منحصر ہے۔ انسان کے اپنے خود ساختہ تمام نظریات ناکام ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی سے اب کامیابی کا کوئی موقع نہیں۔ اور انسان میں اب اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ پھر کسی نئے نظریہ کی تصنیف اور اسکی آزمائش پر اپنی قسمت کی بازی لگا سکے۔ اس حالت میں صرف اسلام ہی ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جس سے انسان فلاح کی توقعات وابستہ کر سکتا ہے، جس کے لیے نوع انسانی کا دین بن جانے کا امکان ہے، اور جسکی پیروی اختیار کر کے انسان کی تباہی ٹل سکتی ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیا بس مفتوح ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہے، اسلام کی خوبیوں پر ایک وعظ اور اس پر ایمان لانے کے لیے ایک دعوت نامہ شائع ہونے کی دیر ہے، پھر ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ سب مسخر ہوتے چلے جائینگے۔ ایک تہذیب کا سقوط اس طرح اچانک نہیں ہوا کرتا کہ کل تھی اور آج ناپید ہو گئی۔ اور دوسری تہذیب کا قیام بھی اس طرح واقع نہیں ہوتا کہ آج چٹیل میدان ہے اور کل کسی منتر کے زور سے ایک عالیشان قصر بن کھڑا ہو۔ گرنے والی تہذیب کے افکار، اصول، طریقے مدتہائے دراز تک دلوں اور دماغوں پر، علوم و آداب پر اور تمدن و معاشرت پر اپنا اثر جمائے رہتے ہیں۔ اس اثر کا استیصال خود بخود نہیں ہو جاتا، کرنے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح گرنے والی تہذیب کے علمبردار بھی زوال پذیر ہونے کے باوجود سالہاسال تک زمین پر قبضہ جمائے رہتے

ہیں۔ وہ خود جگہ چھوڑ کر نہیں ہٹ جاتے، ہٹانے سے ہٹتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس نئی تہذیب پر نئی عمارت بنانا بھی کوئی کھیل نہیں ہے کہ آپ سہولت سے بیٹھے رہیں اور وہ خود بن جائے۔ اس کام کے لیے ایک زبردست تنقیدی، تخریبی اور تعمیری تحریک کی ضرورت ہے، جو ایک طرف علم و فکر کی طاقت سے پرانی تہذیب کی جڑیں اکھاڑ دے اور دوسری طرف علوم و فنون و آداب کو اپنی مخصوص فکری بنیادوں پر از سر نو مدوّن کرے حتیٰ کہ ذہنی دنیا پر اس طرح چھا جائے کہ لوگ اسی کے طرز پر سوچنا اور محسوس کرنا شروع کر دیں، ایک طرف ان پرانے سانچوں کو ڈھائے جن پر انسانیت ڈھلا کرتی تھی اور دوسری طرف نئے سانچے تیار کرے جن سے نئے اخلاق اور نئی سیرتوں کے آدمی ڈھلنے لگیں، ایک طرف پرانے نظام تمدن و سیاست کو بزور مٹائے اور دوسری طرف ایک پورا نظام تمدن و سیاست اپنے اصولوں پر عملاً قائم کر دے۔

پس دنیا کو آئندہ دور ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں ایک صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اسکے لیے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ انکو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ صرف اسی صورت سے دیا جاسکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اسکے خود مطیع بنیں، جس ضابطہ پر ایمان لائے ہیں اسکے خود پابند ہوں، جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اسکا خود نمونہ بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اسکا خود التزام کریں، اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اسے خود چھوڑیں۔ اسکے بغیر تو انکی صداقت آپ ہی مشتبہ ہوگی کجا کہ کوئی اسکے آگے سر تسلیم خم کرے۔ پھر انکو اس فاسد نظام تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہوگی، اس سے اور اسکے پیرووں سے تعلق توڑنا ہوگا، اُن تمام فائدوں، لذتوں، آسائشوں اور امیدوں کو چھوڑنا ہوگا جو اس نظام سے وابستہ ہوں، اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو نظام غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جد و جہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہوگا، اپنے اوقات عزیز بھی صرف کرنے پڑیں گے، اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑیگا، قید اور جلا وطنی اور ضبطی اموال

اور تباہی اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہونگے اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی پڑینگی۔ ان راہوں سے گذرے بغیر دنیا میں کبھی کوئی انقلاب ہوا ہے نہ اب ہو سکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو محض نظریہ خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ ہو کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین پر کبھی جڑیں نہیں پھیلا سکتا۔ نظریہ کی کامیابی کے لیے خود اسکے اصولوں کی طاقت جسقدر ضروری ہے اسیقدر اُن انسانوں کی سیرت، اُنکے عمل، اور انکی قربانی و سرفروشی کی طاقت بھی ضروری ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ زراعت کے طریقہ کی درستی، بیج کی صلاحیت، موسم کی موافقت سب اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں مگر زمین اتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کسان اپنے صبر سے، اپنی محنت سے، اپنے بہتے ہوئے پسینہ سے، اور اپنی جفاکشی سے اس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا، وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی اُگلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

اگرچہ خلوصِ ایمان اور قربانی و جانفشانی ہر دین کے قیام کے لیے ناگزیر ہے، خواہ وہ دینِ حق ہو یا دینِ باطل۔ مگر دینِ حق اُس سے بہت زیادہ اخلاص اور قربانی مانگتا ہے جو دینِ باطل کے قیام کے لیے درکار ہے۔ حق ایک ایسا باریک بیں صراف ہے جو ذرا سی کھوٹ کو بھی قبول کرنیکے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ خالص سونا چاہتا ہے۔ آزمائشوں کی بھٹی میں سے گذر کر جب تک ساری کھوٹ جل نہ جائے اور پورے عیار کا کندن نکل نہ آئے وہ اپنے نام سے اسکو بازار میں لانے کی ذمہ داری لینا پسند نہیں کرتا، کیونکہ وہ حق ہے، باطل نہیں ہے کہ کھوٹے سکے اور ملمع کیے ہوئے زیور بیچتا پھرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (آل عمران - ۱۸)

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان لانے والوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے جس پر تم لوگ اس وقت ہو (کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں) وہ نہ مانیگا جب تک کھوٹے کو کھرے سے الگ نہ کر دے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ، وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (عنکبوت - ۱)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہدینے پر کہ ہم ایمان لائے چھوڑ دیے جائینگے اور انہیں آزمائش کی بھٹی میں تپایا نہ جائیگا حالانکہ ان سے پہلے جو گذرے ہیں (یعنی جنہوں نے بھی ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے) وہ ضرور تپائے گئے ہیں۔ ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً (التوبہ-۲)	کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا اور اللہ اور رسول اور اہل ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا۔
اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (بقرہ-۲۶)	کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا راستہ یونہی مل جائیگا حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت تو گذری ہی نہیں جو تم سے پہلے (ایمان لانے والوں) پر گزر چکی ہے۔ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتی کہ رسول اور اسکے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئیگی۔
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۔ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۔ (العنکبوت-۱)	اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے مگر جب اللہ کی راہ میں انہیں ستایا گیا تو انسانوں کی ایذا سے ایسے ڈرے جیسا اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ حالانکہ اگر تیرے رب کی طرف سے فتح نصیب ہو جائے تو یہی لوگ آکر کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے۔ کیا اللہ اہل دنیا کے دلوں کی حالت سے خوب واقف نہیں ہے؟

مگر ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایمان دار کون ہیں اور منافق کون۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (بقرہ-۱۹)	ہم ضرور تم کو خطرات اور فاقوں سے اور جان و مال اور کمائیوں کے نقصانات سے آزمائیں گے، اور کامیابی کی بشارت دیدو ان مستقل مزاج لوگوں کو جنہوں نے ہر مصیبت کی آمد پر کہا کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ ایسے لوگوں پر انکے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ راہ راست پانے والے ہیں۔

قرآن یہ سب کچھ کہنے کے ساتھ اس حقیقت پر بھی متنبہ کر دیتا ہے کہ

وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ (محمد-۱)

یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اللہ اپنے باغیوں کی سرکوبی خود نہیں کر سکتا اسلیے تم سے مدد مانگتا ہے۔ نہیں، وہ اتنی زبردست طاقت رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک اشارے میں انکو تباہ کر کے رکھدے اور اپنے دین کو خود قائم کر دے، مگر اس نے یہ جہاد اور محنت اور قربانی کا بار تم پر اسلیے ڈالا ہے کہ وہ تم انسانوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں آزمانا چاہتا ہے

جب تک باطل پرستوں سے تمہارا تصادم نہ ہو، اور اس تصادم میں مصائب و شدائد اور خطرات و مہالک پیش نہ آئیں، سچے اہل ایمان جھوٹے مدعیوں سے ممیز نہیں ہو سکتے، اور جب تک ناکارہ لوگوں میں سے کارآمد آدمی چھنٹ کر الگ نہ ہو جائیں وہ جتھا نہیں بن سکتا جو خلافت الٰہیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل ہو۔

لہٰذا آج دنیا کا مستقبل درحقیقت اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ کوئی نظریۂ حق انسان کو ملتا ہے یا نہیں، کیونکہ نظریۂ حق تو موجود ہے، البتہ وہ اگر منحصر ہے تو اس امر پر ہے کہ انسانوں میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جو سچے ایماندار، دُھن کے پکے اور اپنی ہر عزیز و محبوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنیوالے لوگوں پر مشتمل ہو۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ اب کہاں مل سکتے ہیں، وہ تو بس ایک مبارک دور میں پیدا ہوئے تھے اور پھر خالق نے اس ماڈل کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔ لیکن یہ محض ایک وہم ہے اور ایسا وہم انہی لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جنہیں خود اپنے آپ سے مایوسی ہے۔ دنیا میں ہر قابلیت اور ہر صلاحیت کے آدمی ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں منافقانہ مصلحتیں رکھنے والے اور ضعیف الارادہ لوگ اور سہولت پسند اشخاص ہمیشہ پائے گئے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں وہاں ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو کسی چیز پر ایمان لانے کے بعد اس کو سربلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا سکتے ہیں۔ آج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک دو نہیں ہزاروں انسان ایسے ہیں جو ملک اور جرمنی پر ایمان لائے ہیں اور وہ اپنے اس ایمان کی خاطر ہوائی جہاز سے عین دشمن کے ملک میں جست لگاتے ہیں جہاں انکو معلوم ہے کہ بے شمار شکاری انکی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ روس کا انقلاب ابھی چوبیس پچیس (۲۴-۲۵) سال پہلے ہی کی بات ہے۔ اسکی تاریخ آپ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہزارہا آدمی جو انقلابی نظریات پر ایمان رکھتے تھے مسلسل نصف صدی تک ہر قسم کی قربانیاں کرتے رہے، سائبیریا کے جہنم میں بھیجے گئے، پھانسی پر چڑھائے گئے، جلاوطنی کی حالت میں برسوں ملک ملک کی خاک چھانتے پھرے، اپنی ذاتی خوشحالی کی تمام خواہشوں اور تمناؤں کا خون کیا، خانماں بربادی کو خود اپنے ہاتھوں مول لیا، اور یہ سب کچھ اس وقت کیا جبکہ زار کی سلطنت کے مٹنے کا تصور بھی بمشکل ہی کیا جا سکتا تھا۔ دور نہ جائیے خود ہندوستان ہی کو

دیکھ لیجیے۔ یہاں جو نوجوان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے کہ کشت وخون کے ذریعے سے وہ اپنے ملک کو آزاد کرا سکینگے انہوں نے اپنے مقصد کے پیچھے اپنی زندگیوں کو برباد کرنے اور خطرات کا مقابلہ کرنے میں کیا کسر اٹھا رکھی؟ کونسی ممکن التصور مصیبت ایسی تھی جسے انہوں نے برداشت نہ کیا ہو؟ قیدخانوں میں شدید ترین اذیتیں اٹھائیں، حبس دوام میں عمریں گذاردیں، پھانسی کے تختہ پر جانیں تک دیدیں۔ اس سے بحث نہیں کہ انکے نظریات غلط تھے، مگر اس سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کسی مقصد پر ایمان لانے کے بعد اسکے لیے جان و مال اور شخصی امنگوں کی قربانی گوارا کرنے اور مصیبتیں سہنے کی صفت آج بھی انسانوں میں ناپید نہیں ہے۔ گاندھی جی کی سول نافرمانی ابھی حال ہی کی بات ہے۔ کیا اس میں ہندوستان کے باشندوں میں ایسے لوگ موجود نہ تھے جنہوں نے لاٹھیاں کھائیں، جیل گئے اور مالی نقصانات برداشت کیے؟ کیا باردولی کے کسانوں نے اپنی زمینوں، اپنے جانوروں اور اپنے گھر کے برتنوں تک کی قرقی اور نیلام کو صبر کے ساتھ برداشت نہیں کیا؟ پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ آج ایثار و قربانی کی وہ صفات انسانوں میں مفقود ہیں جو پہلے لوگوں میں پائی جاتی تھیں؟ اگر ہٹلر اور مارکس اور گاندھی پر ایمان لاکر انسان یہ سب کچھ کرسکتا ہے، تو کیا خدا پر ایمان لاکر کچھ نہیں کرسکتا؟ اگر خاک وطن میں اتنی کشش ہے کہ اسکے لیے آدمی جان و مال کی قربانی گوارا کرسکتا ہے تو کیا خدا کی رضا اور اسکے تقرب میں اتنی بھی کشش نہیں ہے؟ پس جو لوگ خود پست ہمت اور ضعیف الارادہ ہیں انہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس کار عظیم کے لیے جن اولوالعزم انسانوں کی ضرورت ہے وہ کہیں مل ہی نہیں سکتے، البتہ اپنی ذات کی حد تک وہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُونَ

محرم کی اشاعت میں جماعت اسلامی کی تشکیل کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اسکو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو حضرات اس نصب العین اور اس طریق کار سے متفق ہیں اور اسکے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں یا کر رہے ہیں وہ دفتر ترجمان القرآن کو اپنے عزم سے مطلع فرمائیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ جہاں جہاں اس فکر کے آدمی موجود ہیں انکے درمیان ربط پیدا کیا جائے اور انکے اجتماع کی کوئی صورت نکالی جائے۔ لہذا اگر ہمیں انکے پتے معلوم ہوں تو ایک اجتماعی ہیئت بنانے میں بڑی سہولت ہو جائیگی۔ بہت سے حضرات ایسے ہیں جو مقصد سے متفق ہیں اور کام کرنا چاہتے ہیں، مگر صرف یہ دیکھ کر خاموش بیٹھے ہیں کہ بظاہر کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ اب انہیں مہر سکوت توڑنی چاہیے اور اپنے ارادے کا اظہار کر دینا چاہیے۔ بہت سے حضرات ایسے بھی ہیں جو اپنی اپنی جگہ اس سلسلہ میں کچھ کام کر رہے ہیں۔ مگر انہیں سمجھنا چاہیے کہ ایک فکر اور ایک مقصد رکھنے والے لوگوں کا الگ الگ رہنا اصولاً غلط اور عملاً غیر مفید ہے۔ ایسے سب حضرات اگر دفتر ترجمان القرآن کو ایک واسطہ کی حیثیت سے استعمال کریں تو انکے درمیان رابطہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کیا ہم امید کریں کہ ایسے تمام حضرات غیر ضروری تامل کے بغیر ہمیں اپنے پتوں اور ضروری حالات سے آگاہ فرمادینگے؟

مقالات

اسلام اور جاھلیت

[یہ مقالہ ۲۳ر فروری ۱۹۴۱ء کو مجلس اسلامیات، اسلامیہ کالج پشاور کی دعوت پر پڑھا گیا تھا]

انسان کو دُنیا میں جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی وہ کوئی معاملہ اُس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اس چیز کی ماہیت و کیفیت اور اپنے اور اُسکے باہمی تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرلے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ رائے بجائے خود صحیح ہو یا غلط، مگر بہرحال اسے ان امور کے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنی ضرور پڑتی ہے۔ اور جب تک وہ کوئی رائے قائم نہیں کر لیتا یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ میں اسکے ساتھ کیا طرزِ عمل اور کیا رویّہ (Attitude) اختیار کروں۔ یہ آپکا شب و روز کا تجربہ ہے۔ آپ جب کسی شخص سے ملتے ہیں تو آپکو یہ معلوم کرنیکی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ شخص کون ہے، کس حیثیت، کس مرتبے، کن صفات کا آدمی ہے اور مجھ سے اس کا تعلق کس نوعیت کا ہے؟ اسکے بغیر آپ یہ طے کر ہی نہیں سکتے کہ آپکو اُسکے ساتھ کیا برتاؤ کرنا ہے۔ اگر علم نہیں ہوتا تو بہرحال آپکو قرائن کی بنا پر ایک قیاسی رائے ہی ان امور کے متعلق قائم کرنی پڑتی ہے اور جو رویّہ بھی آپ اُسکے ساتھ اختیار کرتے ہیں اسی رائے کی بنا پر کرتے ہیں۔ جو چیزیں آپ کھاتے ہیں اُنکے ساتھ آپکا یہ معاملہ اسی وجہ سے ہے کہ آپ کے علم یا آپکے قیاس میں وہ چیزیں غذائی ضرورت پوری کرتی ہیں۔ جن چیزوں کو آپ پھینک دیتے ہیں، جنکو آپ استعمال کرتے ہیں، جن کی آپ حفاظت کرتے ہیں،

جنکی آپ تعظیم یا تحقیر کرتے ہیں، جن سے آپ ڈرتے یا محبت کرتے ہیں، اُن سب کے متعلق آپ کے یہ مختلف طرزِ عمل اُسی رائے پر مبنی ہوتے ہیں جو آپ نے اُن چیزوں کی ذات و صفات اور اپنے ساتھ اُنکے تعلق کے بارے میں قائم کی ہے۔

پھر جو رائے آپ اشیاء کے متعلق قائم کیا کرتے ہیں اُسکے صحیح ہونے پر آپکے رویّہ کا صحیح ہونا اور غلط ہونے پر آپکے رویّہ کا غلط ہونا منحصر ہوتا ہے۔ اور خود اس رائے کی غلطی و صحت کا مدار اس چیز پر ہوتا ہے کہ آیا آپ نے علم کی بنا پر رائے قائم کی ہے، یا قیاس پر، یا وہم پر، یا محض مشاہدۂ حسّی پر۔ مثلاً ایک بچّہ آگ کو دیکھتا ہے اور مجرد مشاہدۂ حسّی کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ بڑا خوبصورت چمکدار کھلونا ہے۔ چنانچہ اس رائے کے نتیجہ میں اُس سے یہ طرزِ عمل ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُسے اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اسی آگ کو دیکھ کر وہم سے یا قیاس سے یہ رائے قائم کرتا ہے کہ اسکے اندر الوہیت ہے یا یہ الوہیت کا مظہر ہے۔ چنانچہ اس رائے کی بنا پر وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسکے ساتھ میرا رویّہ یہ ہونا چاہیے کہ میں اسکے آگے سرِ نیاز جھکا دوں۔ ایک تیسرا شخص اسی آگ کو دیکھ اسکی ماہیت اور اسکی صفات کی تحقیق کرتا ہے اور علم و تحقیق کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ پکانے اور جلانے اور تپانے والی ایک چیز ہے، اور میرے ساتھ اس کا تعلق وہ ہے جو ایک مخدوم کے ساتھ خادم کا تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ اس رائے کی بنا پر وہ آگ کو نہ کھلونا بناتا ہے نہ معبود، بلکہ اس سے حسبِ موقع پکانے اور جلانے اور تپانے کی خدمت لیتا ہے۔ اِن مختلف رویّوں میں سے بچّے اور آتش پرست کے رویّے جاہلیت کے رویّے ہیں۔ کیونکہ بچے کی یہ رائے کہ آگ محض کھلونا ہے تجربے سے غلط ثابت ہو جاتی ہے اور آتش پرست کی یہ رائے کہ آگ خود الٰہ ہے یا مظہرِ الوہیت ہے کسی ثبوتِ علمی پر مبنی نہیں بلکہ محض قیاس و وہم پر مبنی ہے۔ بخلاف اسکے آگ سے خدمت لینے والے کا رویّہ علمی رویہ ہے کیونکہ آگ کے متعلق اُسکی رائے علم پر مبنی ہے۔

زندگی کے بنیادی مسائل

اس مقدمہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب ذرا اپنی نظر کو جزئیات سے کلیات پر پھیلائیے۔ انسان اس دنیا میں اپنے آپکو موجود پاتا ہے۔ اسکے پاس ایک جسم ہے جس میں بہت سی قوتیں بھری ہوئی ہیں۔ اس کے سامنے زمین و آسمان کی ایک عظیم الشان بساط پھیلی ہوئی ہے جس میں بے حد و حساب اشیاء ہیں اور وہ اُن اشیاء سے کام لینے کی قدرت اپنے اندر پاتا ہے۔ اسکے گرد و پیش بہت سے انسان، جانور، نباتات، جمادات وغیرہ ہیں اور ان سب سے اسکی زندگی وابستہ ہے۔ اب کیا آپکے نزدیک یہ متصور ہے کہ وہ ان چیزوں کے ساتھ کوئی رویہ اختیار کر سکتا ہے جب تک کہ پہلے خود اپنے بارے میں، ان تمام موجودات کے بارے میں، اور انکے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرے؟ کیا وہ اپنی زندگی کے لیے کوئی راستہ اختیار کر سکتا ہے جب تک یہ طے نہ کرلے کہ میں کون ہوں، کیا ہوں، ذمہ دار ہوں یا غیر ذمہ دار، خود مختار ہوں یا ماتحت، ماتحت ہوں تو کس کا اور جواب دہ ہوں تو کس کے سامنے، میری اس دنیوی زندگی کا کوئی مآل ہے یا نہیں، اور ہے تو کیا ہے؟ اسی طرح کیا وہ اپنی قوتوں کے لیے کوئی مصرف تجویز کر سکتا ہے جب تک اس سوال کا فیصلہ نہ کرلے کہ یہ جسم اور جسمانی قوتیں اسکی اپنی ملک ہیں یا کسی کا عطیہ ہیں، اِن کا حساب کوئی لینے والا ہے یا نہیں، اور ان کے استعمال کا ضابطہ اسے خود متعین کرنا ہے یا کسی اور کو؟ اسی طرح کیا وہ اپنے گرد و پیش کی اشیاء کے متعلق کوئی طرزِ عمل اختیار کر سکتا ہے جب تک اس امر کا تعین نہ کرلے کہ اِن اشیاء کا مالک وہ خود ہے یا کوئی اور، ان پر اُسکے اختیارات محدود ہیں یا غیر محدود، اور محدود ہیں تو حدود مقرر کرنے والا کون ہے؟ اسی طرح کیا وہ آپس میں اپنے ابنائے نوع کے ساتھ برتاؤ کی کوئی شکل متعین کر سکتا ہے جب تک اس معاملہ میں کوئی رائے قائم نہ کرلے کہ انسانیت کس چیز سے عبارت ہے، انسان اور انسان کے درمیان فرق و امتیاز کی بنیاد کیا ہے، اور دوستی و دشمنی، اتفاق و اختلاف، تعاون اور عدم تعاون کی اساس کن

امور پر ہے ؟ اسی طرح کیا وہ بحیثیت مجموعی اس دُنیا کے ساتھ کوئی رویّہ اختیار کر سکتا ہے جب تک اس معاملہ میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچے کہ یہ نظامِ کائنات کس قسم کا ہے، اور اس میں میری کیا حیثیت ہے ؟

جو مقدمہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اُسکی بنا پر بلا تأمل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام امور کے متعلق ایک ایک رائے قائم کیے بغیر کوئی رویّہ اختیار کرنا غیر ممکن ہے۔ فی الواقع ہر انسان جو دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے، اِن سوالات کے متعلق شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر کوئی نہ کوئی رائے ضرور رکھتا ہے اور رکھنے پر مجبور ہے، کیونکہ وہ اس رائے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص نے اِن سوالات پر فلسفیانہ غور و فکر کیا ہو اور واضح طور پر تنقیحات قائم کر کے ایک ایک سوال کا فیصلہ کیا ہو۔ نہیں، بہت سے آدمیوں کے ذہن میں اِن سوالات کی سرے سے کوئی متعیّن صُورت ہوتی ہی نہیں۔ نہ وہ کبھی ان پر بالارادہ سوچتے ہیں۔ مگر باوجود اسکے ہر آدمی اجمالی طور پر ان سوالات کے متعلق منفی یا مثبت پہلو میں ایک رائے پر لازماً پہنچ جاتا ہے، اور زندگی میں اُس کا جو رویّہ بھی ہوتا ہے لازمی طور پر اُسی رائے کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ بات جس طرح اشخاص کے معاملہ میں صحیح ہے اسی طرح جماعتوں کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ چونکہ یہ سوالات انسانی زندگی کے بنیادی سوالات ہیں اس لیے کوئی نظام تمدن و تہذیب اور حیاتِ اجتماعی کے لیے کوئی لائحہ بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ ان سوالات کا کوئی جواب متعین نہ کر لیا جائے۔ اور ان کا جو جواب بھی متعین کیا جائیگا اُسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریّہ قائم ہوگا، اسی کی نوعیت کے مطابق زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی اور فی الجملہ پُورا تمدن ویسا ہی رنگ اختیار کریگا جیسا اُس جواب کا مقتضا ہوگا۔ درحقیقت اس معاملہ میں کوئی تخلّف ممکن ہی نہیں ہے۔ خواہ ایک شخص کا رویہ ہو یا ایک سوسائیٹی کا، بہرحال وہ ٹھیک وہی نوعیت اختیار کریگا جو ان سوالات کے جواب کی نوعیت ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر آپ چاہیں تو ایک شخص یا ایک جماعت کے رویّہ کا تجزیہ کر کے بآسانی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس رویّہ کی تہ میں زندگی کے اِن بنیادی سوالات کا کونسا جواب کام کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ بات قطعی محال ہے

کہ کسی شخصی یا اجتماعی رویّہ کی نوعیت کچھ ہو اور ان سوالات کے جواب کی نوعیت کچھ اور ہو۔ اختلاف زبانی دعوے اور واقعی رویّہ کے درمیان تو ضرور ہو سکتا ہے، لیکن ان سوالات کا جو جواب درحقیقت نفس کے اندر متمکن ہے اُسکی نوعیت اور عملی رویّہ کی نوعیت میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

اچھا اب ہمیں ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہیے۔ زندگی کے یہ بنیادی مسائل جنکے متعلق ابھی آپ نے سُنا کہ ان کا کوئی حل اپنے ذہن میں متعین کیے بغیر آدمی دنیا میں ایک قدم نہیں چل سکتا، اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ سب کے سب امور غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا کوئی جواب اُفق پر لکھا ہُوا نہیں ہے کہ ہر انسان دُنیا میں آتے ہی اسکو پڑھ لے۔ اور ان کا کوئی جواب ایسا بدیہی بھی نہیں ہے کہ ہر انسان کو خود بخود معلوم ہو جائے۔ اسی وجہ سے ان کا کوئی ایک حل نہیں ہے جس پر سارے انسان متفق ہوں۔ بلکہ انکے بارے میں ہمیشہ انسانوں کے درمیان اختلاف رہا ہے اور ہمیشہ مختلف انسان مختلف طریقوں سے انکو حل کرتے رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ انکو حل کرنے کی کیا صورتیں ممکن ہیں، کیا صورتیں دُنیا میں اختیار کی گئی ہیں، اور ان مختلف صورتوں سے جو حل نکلتے ہیں وہ کس قسم کے ہیں؟

انکے حل کی ایک صُورت یہ ہے کہ آدمی اپنے حواس پر اعتماد کرے اور حواس سے جیسا کچھ محسوس ہوتا ہے اُسی کی بنا پر ان امُور کے متعلق ایک رائے قائم کرلے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشاہدۂ حسی کے ساتھ وہم و قیاس کو ملا کر ایک نتیجہ اخذ کیا جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ پیغمبروں نے حقیقت کا براہِ راست علم رکھنے کا دعویٰ کرتے ہوئے ان مسائل کا جو حل بیان کیا ہے اسکو قبول کر لیا جائے۔

دُنیا میں اب تک اِن مسائل کے حل کی یہی تین صورتیں اختیار کی گئی ہیں، اور غالباً یہی تین صورتیں ممکن بھی ہیں۔ ان میں سے ہر صورت ایک جداگانہ طریقہ سے اِن مسائل کو حل کرتی ہے، ہر ایک حل سے ایک خاص قسم کا رویّہ وجود میں آتا ہے اور ایک خاص نظامِ اخلاق اور نظامِ تمدن بنتا ہے جو

اپنی بنیادی خصوصیات میں دوسرے تمام علوں کے پیدا کردہ رویوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ان مختلف طریقوں سے ان مسائل کے کیا حل نکلتے ہیں اور ہر ایک حل کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے۔

خالص جاہلیت

حواس پر اعتماد کرکے جب انسان اِن مسائل کے متعلق کوئی رائے قائم کرتا ہے تو اس طرزِ فکر کی عین فطرت کے تقاضے سے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود و ظہور ہے جس کے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد نہیں۔ یونہی بن گیا ہے۔ یونہی چل رہا ہے۔ اور یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائیگا۔ اس کا کوئی مالک نظر نہیں آتا لہذا وہ یا تو ہے ہی نہیں یا اگر ہے تو انسان کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو شائد اتفاقاً یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ اس کو کسی نے پیدا کیا یا یہ خود پیدا ہو گیا۔ بہرحال یہ سوال خارج از بحث ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے۔ کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لیے اسکی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے۔ کچھ قوی اور کچھ آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اور اسکے گردوپیش زمین کے دامن پر بے حدوحساب سامان پھیلا ہوا ہے جس پر یہ اپنے قویٰ اور آلات کو استعمال کرکے اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہذا اسکی قوتوں کا کوئی مصرف اسکے سوا نہیں کہ یہ اپنی خواہشات وضروریات کو زیادہ سے زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرے۔ اور دنیا کی کوئی حیثیت اسکے سوا نہیں کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جو اس لیے پھیلا ہوا ہے کہ انسان اس پر ہاتھ مارے۔ اوپر کوئی صاحبِ امر نہیں جسکے سامنے انسان جوابدہ ہو۔ اور نہ کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود ہے جہاں سے انسان کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو۔ لہذا انسان ایک خود مختار اور غیر ذمہ دار ہستی ہے۔ اپنے لیے ضابطہ و قانون بنانا اور اپنی قوتوں کا مصرف تجویز کرنا، اور موجودات کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کا تعین کرنا اس کا اپنا کام ہے۔

اسکے لیے اگر کوئی ہدایت ہے تو جانوروں کی زندگی میں، پتھروں کی سرگزشت میں، یا خود اپنی تاریخ کی تجربات میں ہے۔ اور یہ اگر کسی کے سامنے جوابدہ ہے تو آپ اپنے سامنے یا اُس اقتدار کے سامنے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائے۔ زندگی جو کچھ ہے یہی دنیوی زندگی ہے اور اعمال کے سارے نتائج اسی زندگی کی حد تک ہیں۔ لہٰذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر، قابلِ اخذ اور قابلِ ترک ہونے کا فیصلہ صرف اُنہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائیگا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ ایک پورا نظریۂ حیات ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا جواب حسّی مشاہدہ پر دیا گیا ہے۔ اور اس جواب کا ہر جزء دوسرے جزء کے ساتھ کم از کم ایک منطقی ربط اور ایک مزاجی موافقت ضرور رکھتا ہے جسکی وجہ سے انسان دُنیا میں ایک ہموار و یکساں رویّہ اختیار کرسکتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ جواب اور اس سے پیدا ہونے والا رویّہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ اب اُس رویّہ پر ایک نگاہ ڈالیے جو اس جواب کی بنا پر آدمی دُنیا میں اختیار کرتا ہے۔

انفرادی زندگی میں اس نقطۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اوّل سے لے کر آخر تک خود مختارانہ اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار کرے۔ وہ اپنے آپ کو اپنے جسم اور اپنی جسمانی قوتوں کا مالک سمجھیگا، اس لیے اپنے حسب منشا جس طرح چاہے گا اُنہیں استعمال کریگا۔ دُنیا کی جو چیزیں اسکے قبضہ قدرت میں آئیں گی اور جن انسانوں پر اسکو اقتدار حاصل ہوگا ان سب کے ساتھ وہ اس طرح برتاؤ کریگا جیسے کہ وہ ان کا مالک ہے۔ اسکے اختیارات کو محدود کرنے والی چیز صرف قوانین قدرت کی حدیں اور اجتماعی زندگی کی ناگزیر بندشیں ہوں گی۔ خود اُسکے اپنے نفس میں کوئی ایسا اخلاقی احساس ـــــ ذمہ داری کا احساس اور کسی بازپرس کا خوف ـــــ نہ ہوگا جو اسے شتر بے مہار بننے سے روکتا ہو۔ جہاں خارجی رکاوٹیں نہ ہوں، یا جہاں وہ ان رکاوٹوں کے علی الرغم کام کرنے پر قادر ہو وہاں تو اسکے عقیدہ کا فطری اقتضاء یہ ہے کہ وہ ظالم، بددیانت، شریر اور مفسد ہو۔ وہ فطرتاً خود غرض،

مادّہ پرست، اور ابن الوقت ہوگا۔ اسکی زندگی کا کوئی مقصد اپنی نفسانی خواہشات اور حیوانی ضروریات کی خدمت کے سوا نہ ہوگا، اور اسکی نگاہ میں قدر و قیمت صرف اُن چیزوں کی ہوگی جو اُسکے اِس مقصدِ زندگی کے لیے کوئی قیمت رکھتی ہوں۔ افراد میں یہ سیرت و کردار پیدا ہونا اس عقیدے کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔ بے شک یہ ممکن ہے کہ مصلحت اور دور اندیشی کی بنا پر ایسا شخص ہمدرد ہو، ایثار پیشہ ہو، اپنی قوم کی فلاح و ترقی کے لیے جان توڑ کوشش کرتا ہو، اور فی الجملہ اپنی زندگی میں ایک طرح کے ذمہ دارانہ اخلاق کا اظہار کرے۔ لیکن جب آپ اسکے اس رویہ کا تجزیہ کرینگے تو معلوم ہوگا کہ دراصل یہ اسکی خودغرضی و نفسانیت ہی کی توسیع ہے۔ وہ اپنے ملک یا اپنی قوم کی بھلائی میں اپنی بھلائی دیکھتا ہے اس لیے اسکی بھلائی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص زیادہ سے زیادہ بس ایک نیشنلسٹ ہی ہو سکتا ہے۔

پھر جو سوسائٹی اس ذہنیت کے افراد سے بنے گی اُسکی امتیازی خصوصیات یہ ہونگی: سیاست کی بنیاد انسانی حاکمیت پر قائم ہوگی، خواہ وہ ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک طبقہ کی حاکمیت ہو، یا جمہور کی حاکمیت۔ زیادہ سے زیادہ بلند اجتماعی تصور جو قائم کیا جاسکے گا وہ بس دولت مشترکہ (Common wealth) کا تصور ہوگا۔ اس مملکت میں قانون ساز انسان ہونگے۔ تمام قوانین خواہش اور تجربی مصلحت کی بنا پر بنائے اور بدلے جائینگے۔ اور منفعت پرستی و مصلحت پرستی ہی کے لحاظ سے پالیسیاں بھی بنائی اور بدلی جائیں گی۔ مملکت کے حدود میں وہ لوگ زور کرکے اُبھر آئینگے جو سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ چالاک مکار، جھوٹے، دغاباز، سنگدل اور خبیث النفس ہونگے۔ سوسائٹی کی رہنمائی اور مملکت کی زمامِ کار انہی کے ہاتھ میں ہوگی، اور انکی کتابِ آئین میں زور کا نام حق، اور بے زوری کا نام باطل ہوگا۔ تمدن و معاشرت کا سارا نظام نفس پرستی پر قائم ہوگا۔ لذاتِ نفس کی طلب ہر اخلاقی قید سے آزاد ہوتی چلی جائیگی، اور تمام اخلاقی معیار اس طرح قائم کیے جائینگے کہ انکی وجہ سے لذتوں کے حصول میں کم سے کم

رکاوٹ ہو۔ اسی ذہنیت سے آرٹ اور لٹریچر متاثر ہونگے اور انکے اندر عُریانی و شہوانیت کے عناصر بڑھتے چلے جائینگے۔ معاشی زندگی میں کبھی جاگیرداری سسٹم برسرِ عروج آئیگا، کبھی سرمایہ داری نظام اسکی جگہ لیگا اور کبھی مزدور شورش کرکے اپنی ڈکٹیٹرشپ قائم کرلیں گے۔ عدل سے بہرحال معیشت کا رشتہ کبھی قائم نہ ہوسکیگا، کیونکہ دنیا اور اسکی دولت کے بارے میں اس سوسائٹی کے ہر فرد کا بنیادی رویہ اس تصور پر مبنی ہوگا کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جس پر حسبِ منشاء اور حسبِ موقع ہاتھ مارنے کے لیے وہ آزاد ہے پھر اس سوسائٹی میں افراد کو تیار کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کا جو نظام قائم ہوگا اُسکا مزاج بھی اسی تصورِ حیات اور اسی رویہ کے مناسبِ حال ہوگا۔ اُس میں ہر نئی آنے والی نسل کو دنیا اور انسان، اور دنیا میں انسان کی حیثیت کے متعلق وہی تصور دیا جائیگا جسکی تشریح میں نے اوپر کی ہے۔ تمام معلومات، خواہ وہ کسی شعبۂ علم سے متعلق ہوں، اُن کو ایسی ہی ترتیب کے ساتھ دی جائینگی کہ آپ سے آپ اُنکے ذہن میں زندگی کا یہ تصور پیدا ہوجائے۔ اور پھر ساری تربیت اِس ڈھنگ کی ہوگی کہ وہ زندگی میں یہی رویہ اختیار کرنے اور اسی طرز کی سوسائٹی میں کھپ جانے کے لیے تیار ہوں۔ اس تعلیم و تربیت کی خصوصیات کے متعلق مجھے آپ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ آپ لوگوں کو اسکا ذاتی تجربہ ہے۔ جن درسگاہوں میں آپ تربیت پارہے ہیں وہ سب اسی نظریہ پر قائم ہوئی ہیں اگرچہ اُنکے نام اسلامیہ کالج اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ ہیں۔

یہ رویہ جسکی تشریح میں نے ابھی آپکے سامنے کی، خالص جاہلیت کا رویہ ہے۔ اسکی نوعیت وہی ہے جو اُس بچے کے رویے کی نوعیت ہے جو محض حسی مشاہدے پر اعتماد کرکے آگ کو ایک خوبصورت کھلونا سمجھتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اس مشاہدے کی غلطی فوراً تجربے سے ظاہر ہوجاتی ہے، کیونکہ جس آگ کو کھلونا سمجھ کر وہ دست اندازی کا رویہ اختیار کرتا ہے وہ گرم آگ ہوتی ہے، ہاتھ لگاتے ہی فوراً بتا دیتی ہے کہ میں کھلونا نہیں ہوں۔ بخلاف اسکے یہاں مشاہدے کی غلطی بڑی دیر میں کھلتی ہے، بلکہ بہتوں پر کھلتی ہی نہیں، کیونکہ جس آگ پر یہ ہاتھ ڈالتے ہیں اُسکی آنچ دھیمی ہے، فوراً اُجر کا نہیں دیتی

بلکہ صدیوں تک تپاتی رہتی ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص تجربات سے سبق لینے کے لیے تیار ہو تو نشیب و روز کی زندگی میں اس نظریہ کی بدولت افراد کی بے ایمانیوں، حکام کے مظالم، منصفوں کی بے انصافیوں، مالداروں کی خود غرضیوں، اور عام لوگوں کی بداخلاقیوں کا جو تلخ تجربہ اسکو ہوتا ہے، اور بڑے پیمانے پر اسی نظریہ سے قوم پرستی، امپیریلزم، جنگ، فساد، ملک گیری اور اقوام کُشی کے جو ثمرات نکلتے ہیں اُنکے تجربوں سے وہ یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ رویہ جاہلیت کا رویہ ہے علمی رویہ نہیں ہے۔ کیونکہ انسان نے اپنے متعلق اور نظام کائنات کے متعلق جو رائے قائم کرکے یہ رویہ اختیار کیا ہے وہ امر واقعی کے مطابق نہیں ہے ورنہ اس سے یہ بُرے نتائج ظاہر نہ ہوتے۔

اب ہمیں دوسرے طریقہ کا جائزہ لینا چاہیے۔ زندگی کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مشاہدے کے ساتھ قیاس و وہم سے کام لیکر ان مسائل کے متعلق کوئی رائے قائم کی جائے۔ اس طریقے سے تین مختلف رائیں قائم کی گئی ہیں اور ہر ایک رائے سے ایک خاص قسم کا رویہ پیدا ہوا ہے:

شرک

۱۔ ایک رائے یہ ہے کہ کائنات کا یہ نظام بے خداوند تو نہیں ہے، مگر اسکا ایک خداوند (الٰہ یا رب) نہیں، بلکہ بہت سے خداوند (آلہہ اور ارباب) ہیں۔ کائنات کی مختلف قوتوں کا سررشتہ مختلف خداؤں کے ہاتھ میں ہے اور انسان کی سعادت و شقاوت، کامیابی و ناکامی، نفع و نقصان بہت سی ہستیوں کی مہربانی و نامہربانی پر منحصر ہے۔ یہ رائے جن لوگوں نے اختیار کی ہے اُنہوں نے پھر اپنے وہم و قیاس سے کام لیکر یہ تعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدائی کی طاقتیں کہاں کہاں اور کس کس کے ہاتھ میں ہیں۔ اور جن جن چیزوں پر بھی اُنکی نگاہ جاکر ٹھیری ہے اُنہی کو خدا مان لیا ہے۔

اس رائے کی بنا پر جو طرزِ عمل انسان اختیار کرتا ہے اسکی امتیازی خصوصیات یہ ہیں:

اوّلاً اس سے آدمی کی پوری زندگی اوہام کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ وہ کسی علمی ثبوت کے

بغیر مجرد اپنے وہم وخیال سے بہت سی چیزوں کے متعلق یہ رائے قائم کرتا ہے کہ وہ فوق الفطری طریقوں سے اسکی قسمت پر اچھا یا بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ اس پر وہ اچھے اثرات کی موہوم امید اور بُرے اثرات کے موہوم خوف میں مبتلا ہو کر اپنی بہت سی قوتیں لاحاصل طریقہ سے ضائع کر دیتا ہے۔ کہیں کسی قبر سے اُمید لگاتا ہے کہ یہ میرا کام کر دے گی۔ کہیں کسی بُت پر بھروسہ کرتا ہے کہ وہ میری قسمت بنا دے گا۔ کہیں کسی اور خیالی کارساز کو خوش کرنے کے لیے دوڑتا پھرتا ہے۔ کہیں کسی بُرے شگون سے دل شکستہ ہو جاتا ہے۔ اور کہیں کسی اچھے شگون سے توقعات کے خیالی قلعے بنا لیتا ہے۔ یہ ساری چیزیں اسکے خیالات اور اسکی کوششوں کو فطری تدابیر کے راستہ سے ہٹا کر ایک بالکل غیر فطری راستہ پر ڈال دیتی ہیں۔

ثانیاً، اس رائے کی وجہ سے پوجا پاٹ، نذر نیاز، اور دوسری رسموں کا ایک لمبا چوڑا دستور العمل بنتا ہے جس میں الجھ کر آدمی کی سعی وعمل کا ایک بڑا حصہ بے نتیجہ مشغولیتوں میں صرف ہو جاتا ہے۔

ثالثاً، جو لوگ اس مشرکانہ وہم پرستی میں مبتلا ہوتے ہیں اُنکو بے وقوف بنا کر اپنے جال میں پھانس لینے کا چالاک آدمیوں کو خوب موقع مل جاتا ہے۔ کوئی بادشاہ بنکر بیٹھتا ہے اور سورج یا چاند، یا دوسرے دیوتاؤں سے اپنا نسب ملا کر لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہم بھی خداؤں میں سے ہیں اور تم ہمارے بندے ہو۔ کوئی پروہت یا مجاور بن بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارا نفع ونقصان جن سے وابستہ ہے ان سے ہمارا تعلق ہے اور تم ہمارے ہی واسطے سے ان تک پہنچ سکتے ہو۔ کوئی پنڈت اور پیر بن جاتا ہے اور تعویذ گنڈوں اور منتروں اور عملیات کا ڈھونگ رچا کر لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہماری یہ چیزیں فوق الفطری طریقے سے تمہاری حاجتیں پُوری کرینگی۔ پھر ان سب چالاک لوگوں کی نسلیں مستقل خاندانوں اور طبقوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جنکے حقوق، امتیازات، اور اثرات امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور گہری بنیادوں پر جمتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اس عقیدہ کی بدولت عام انسانوں کی گردنوں پر شاہی خاندانوں، مذہبی عہدہ داروں اور روحانی پیشواؤں کی خدائی کا جُوا مسلط ہوتا ہے اور یہ بناوٹی خدا اُنکو اس طرح اپنا خادم بناتے ہیں کہ گویا وہ اِنکے لیے دودھ دینے

اور سواری اور بار برداری کے جانور ہیں۔

نتائج: یہ نظریہ نہ تو علوم و فنون، فلسفہ و ادب، اور تمدن و سیاست کے لیے کوئی مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اور نہ اُن خیالی خداؤں سے انسانوں کو کسی قسم کی ہدایت ہی ملتی ہے کہ وہ اُسکی پابندی کریں۔ ان خداؤں سے تو انسان کا تعلق صرف اس حد تک محدود رہتا ہے کہ یہ اُنکی مہربانی و اعانت حاصل کرنے کے لیے بس عبودیت کے چند مراسم ادا کردے۔ باقی رہے زندگی کے معاملات تو انکے متعلق تو انین اور ضوابط بنانا اور عمل کے طریقے معین کرنا انسان کا اپنا کام ہوتا ہے۔ اس طرح مشرک سوسائٹی عملاً انہی سب راہوں پر چلتی ہے جنکا ذکر خالص جاہلیت کے سلسلہ میں ابھی میں آپ سے کرچکا ہوں۔ وہی اخلاق اور وہی اعمال، وہی طرز تمدن، وہی سیاست، وہی نظام معیشت، اور وہی علم و ادب۔ ان تمام حیثیتوں سے شرک کے رویے اور خالص جاہلیت کے رویہ میں کوئی اصولی فرق نہیں ہوتا۔

رہبانیت

۲- دوسری رائے جو مشاہدے کے ساتھ قیاس و وہم کو ملا کر قائم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دُنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لیے ایک دار العذاب ہے۔ انسان کی روح ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت سے اس قفس میں بند کی گئی ہے۔ لذات و خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں اصل میں یہ اس قیدخانہ کے طوق و سلاسل ہیں۔ انسان جتنا اس دنیا اور اسکی چیزوں سے تعلق رکھے گا اتنا ہی ان زنجیروں میں پھنستا چلا جائیگا اور مزید عذاب کا مستحق ہوگا۔ نجات کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ زندگی کے سارے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جائے۔ خواہشات کو مٹایا جائے۔ لذات سے کنارہ کشی کی جائے جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبوں کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے۔ اُن تمام محبتوں کو دل سے نکال دیا جائے جو گوشت و خون کے تعلق سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اپنے اس دشمن، یعنی نفس و جسم کو مجاہدوں اور ریاضتوں سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اُس کا تسلط قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح روح

ہلکی اور پاک صاف ہو جائیگی اور نجات کے بلند مقام پر اُڑنے کی طاقت حاصل کرلے گی۔

اس رائے سے جو رویّہ پیدا ہوتا ہے اسکی خصوصیات یہ ہیں:-

اوّلاً، اس سے انسان کے تمام رجحانات اجتماعیت سے انفرادیت کی طرف اور تمدن سے وحشت کی طرف پھر جاتے ہیں۔ وہ دُنیا اور اُس کی زندگی سے مُنہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ذمہ داریوں سے بھاگتا ہے۔ اسکی ساری زندگی عدم تعاون اور ترک موالات کی زندگی بن جاتی ہے۔ اور اسکے اخلاق زیادہ تر سلبی (Negative) نوعیت کے ہو جاتے ہیں۔

ثانیاً، اس رائے کی بدولت نیک لوگ دُنیا کے کاروبار سے ہٹ کر اپنی نجات کی فکر میں گوشہ ہائے عزلت کی طرف چلے جاتے ہیں اور دُنیا کے سارے معاملات شریر لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتے ہیں۔

ثالثاً، تمدن میں اس رائے کا اثر جس حد تک پہنچتا ہے اس سے لوگوں کے اندر سلبی اخلاقیات، غیر تمدنی (Anti-social) اور انفرادیت پسندانہ (Individualistic) رجحانات اور مایوسانہ خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ انکی عملی قوتیں سرد ہو جاتی ہیں۔ وہ ظالموں کے لیے نرم نوالہ بن جاتے ہیں اور ہر جابر حکومت انکو آسانی سے قابو میں لاسکتی ہے۔ درحقیقت یہ نظریہ عوام کو ظالموں کے لیے ذلول (Tame) بنانے میں جادو کی تاثیر رکھتا ہے۔

رابعاً، انسانی فطرت سے اس راہبانہ نظریہ کی مستقل جنگ رہتی ہے اور اکثر یہ اُس سے شکست کھا جاتا ہے۔ پھر جب یہ شکست کھاتا ہے تو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے اسے حیلوں کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے کہیں کفارہ کا عقیدہ ایجاد ہوتا ہے۔ کہیں عشق مجازی کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے اور کہیں ترکِ دُنیا کے پردے میں وہ دنیا پرستی کی جاتی ہے جسکے آگے دنیا پرست بھی شرما جائیں۔

ہمہ اوست

۳- تیسری رائے جو مشاہدہ اور قیاس کی آمیزش سے پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ انسان اور کائنات کے

اور کائنات کی تمام چیزیں بجائے خود غیر حقیقی ہیں - ان کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے - دراصل ایک وجود نے ان ساری چیزوں کو خود اپنے ظہور کا واسطہ بنایا ہے اور وہی ان سب کے اندر کام کر رہا ہے تفصیلات میں اس نظریہ کی بے شمار صورتیں ہیں - مگر ان ساری تفصیلات کے اندر قدر مشترک یہی ایک خیال ہے کہ تمام موجودات ایک ہی وجود کا ظہور خارجی ہیں اور دراصل موجود وہی ہے باقی کچھ نہیں -

اس نظریہ کی بنا پر جو رویہ انسان اختیار کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے خود اپنے ہونے ہی میں شک ہو جاتا ہے کجا کہ وہ کوئی کام کرے - وہ اپنے آپکو ایک ایسی کٹھ پتلی سمجھتا ہے جسے کوئی اور نچا رہا ہے یا جسکے اندر کوئی اور ناچ رہا ہے - وہ اپنے تخیلات کے نشے میں گم ہو جاتا ہے - اسکے لیے نہ کوئی مقصدِ زندگی ہوتا ہے اور نہ کوئی راہ عمل - وہ خیال کرتا ہے کہ میں خود تو کچھ ہوں ہی نہیں کہ نہ میرے کرنے کا کوئی کام ہے، نہ میرے کیے سے کچھ ہو سکتا ہے - اصل میں تو وہ وجودِ کلی جو مجھ میں اور تمام کائنات میں سرایت کیے ہوئے ہے اور جو ازل سے ابد تک چلا جا رہا ہے، سارے کام اسی کے ہیں اور وہی سب کچھ کرتا ہے - وہ اگر مکمل ہے تو میں بھی مکمل ہوں، پھر کوشش کس چیز کے لیے؟ اور وہ اگر اپنی تکمیل کے لیے کوشاں ہے تو جس عالم گیر حرکت کے ساتھ وہ کمال کی طرف جا رہا ہے اسی پیٹ میں ایک جزء کی حیثیت سے میں بھی آپ سے آپ چلا جاؤں گا - میں ایک جزء ہوں، مجھے کیا خبر کہ کُل کدھر جا رہا ہے اور کدھر جانا چاہتا ہے؟

اس طرزِ خیال کے عملی نتائج قریب قریب وہی ہیں جو ابھی میں نے راہبانہ نظریہ کے سلسلہ میں بیان کیے ہیں - بلکہ بعض حالات میں اس رائے کو اختیار کرنے والے کا طرزِ عمل اُن لوگوں کے رویہ سے ملتا جلتا ہوتا ہے جو خالص جاہلیت کا نظریہ اختیار کرتے ہیں - کیونکہ یہ اپنی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے اور پھر جدھر خواہشات لے جاتی ہیں اس طرف یہ سمجھتے ہوئے بے تکلف چلا جاتا ہے کہ جانے والا وجود کلی ہے نہ کہ میں -

پہلے نظریہ کی طرح یہ تینوں نظریے بھی جاہلیت کے نظریے ہیں۔ اور اس بنا پر جو رویے ان سے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی جاہلیت ہی کے رویے ہیں۔ اس لیے کہ اول تو ان میں سے کوئی نظریہ بھی کسی علمی ثبوت پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیالی اور قیاسی بنیادوں پر مختلف رائیں قائم کر لی گئی ہیں۔ دوسرے ان کا واقعہ کے خلاف ہونا تجربہ سے ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی رائے بھی امر واقعی کے مطابق ہوتی تو اس کے مطابق عمل کرنے سے بُرے نتائج تجربے میں نہ آتے۔ جب آپ دیکھتے ہیں کہ ایک چیز کو جہاں کہیں انسان نے کھایا اُسکے پیٹ میں درد ضرور ہوا تو اس تجربے سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فی الواقع معدہ کی جو ساخت ہے اور جو اسکی طبیعت ہے، یہ چیز اس کے مطابق نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جب یہ حقیقت ہے کہ شرک، رہبانیت اور وجودیت کے نظریے اختیار کرنے سے انسان کو بحیثیت مجموعی نقصان ہی پہنچا تو یہ بھی اس امر کا ثبوت ہے کہ ان میں سے کوئی نظریہ بھی واقعہ اور حقیقت کے مطابق نہیں ہے۔

اسلام

اب ہمیں تیسری صورت کو لینا چاہیے جو زندگی کے ان بنیادی مسائل کے متعلق رائے قائم کرنے کی آخری صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ پیغمبروں نے ان مسائل کا جو حل پیش کیا ہے اُسے قبول کیا جائے۔

اس طریقہ کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی اجنبی مقام پر آپ ہوں اور آپکو خود اُس مقام کے متعلق کوئی واقفیت نہ ہو تو آپ کسی دوسرے شخص سے دریافت کریں اور اُسکی راہ نمائی میں وہاں کی سیر کریں۔ ایسی صورتِ حال جب پیش آتی ہے تو آپ پہلے اُس شخص کو تلاش کرتے ہیں جو خود واقف کار ہونیکا دعویٰ کرے، پھر آپ قرائن سے اس امر کا اطمینان کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ شخص قابلِ اعتماد ہے یا نہیں، پھر آپ اس کی راہ نمائی میں چل کر دیکھتے ہیں، اور جب تجربہ سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اسکی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جو عمل آپ نے کیا اس سے کوئی بُرا نتیجہ نہیں نکلا تو آپکو پوری طرح اطمینان ہوجاتا ہے کہ واقعی وہ شخص واقف کار تھا اور اس جگہ کے متعلق جو معلومات اُس نے دی تھیں وہ صحیح تھیں۔

یہ ایک علمی طریقہ ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا طریق علمی ممکن نہ ہو تو پھر رائے قائم کرنے کے لیے یہی ایک صحیح طریقہ ہو سکتا ہے۔

اب دیکھیے دُنیا آپ کے لیے ایک اجنبی جگہ ہے۔ آپکو نہیں معلوم کہ اسکی حقیقت کیا ہے، اس کا انتظام کس قسم کا ہے، کس آئین پر یہ کارخانہ چل رہا ہے، اسکے اندر آپکی کیا حیثیت ہے، اور یہاں آپکے لیے کیا رویہ مناسب ہے۔ آپ نے پہلے یہ رائے قائم کی کہ جیسا بظاہر نظر آتا ہے اصل حقیقت بھی وہی ہے۔ آپ نے اس رائے پر عمل کیا مگر نتیجہ غلط نکلا۔ پھر آپ نے قیاس اور گمان کی بنا پر مختلف رائیں قائم کیں اور ہر ایک پر عمل کرکے دیکھا مگر ہر صورت میں نتیجہ غلط ہی رہا۔ اس کے بعد آخری صورت یہی ہے کہ آپ پیغمبروں کی طرف رجوع کریں۔ یہ لوگ واقف کار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انکے حالات کی جتنی چھان بین کی جاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سچے، نہایت امین، نہایت نیک، نہایت بے غرض، اور نہایت صحیح الدماغ لوگ ہیں۔ لہٰذا بادی النظر میں اُن پر اعتماد کرنے کے لیے کافی وجہ موجود ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ دنیا کے متعلق اور دنیا میں آپکی حیثیت کے متعلق جو معلومات وہ دیتے ہیں وہ کہاں تک لگتی ہوئی ہیں، ان کے خلاف کوئی علمی ثبوت تو نہیں ہے، اور انکے مطابق جو رویہ دنیا میں اختیار کیا گیا وہ تجربہ سے کیسا ثابت ہوا۔ اگر تحقیق سے ان تینوں باتوں کا جواب بھی اطمینان بخش نکلے تو ان کی راہ نمائی پر ایمان لے آنا چاہیے اور زندگی میں وہی رویہ اختیار کرنا چاہیے جو اس نظریہ کے مطابق ہو۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا پچھلے جاہلیت کے طریقوں کے مقابلہ میں یہ طریقہ علمی طریقہ ہے۔ اور اگر اس علم کے آگے آدمی سر تسلیم خم کر دے، اگر خود سری اور خود رائی چھوڑ کر اس علم کا اتباع کرے، اور اپنے رویہ کو انہی حدود کا پابند بنا دے جو اس علم نے قائم کی ہیں تو اسی طریقہ کا نام اسلامی طریقہ ہے۔

انبیاء کا نظریہ کائنات و انسان

پیغمبر کہتے ہیں:

یہ سارا عالم ہست و بود جو انسان کے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جزو انسان بھی ہے کوئی اتفاقی ہنگامہ نہیں ہے بلکہ ایک منظم، باضابطہ سلطنت ہے۔ اللہ نے اسکو بنایا ہے وہی اس کا مالک ہے۔ اور وہی اس کا اکیلا حاکم ہے۔ یہ ایک کلی نظام (Totalitarian System) ہے جس میں تمام اختیارات مرکزی اقتدار کے ہاتھ میں ہیں۔ اُس مقتدر اعلیٰ کے سوا یہاں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ تمام قوتیں جو نظام عالم میں کام کر رہی ہیں، اُسی کے زیر حکم ہیں اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے، یا اس کے اذن کے بغیر اپنے اختیار سے کوئی حرکت کرے۔ اس ہمہ گیر سسٹم کے اندر کسی کی خود مختاری (Independence) اور غیر ذمہ داری (Irresponsibility) کے لیے کوئی جگہ نہیں، نہ فطرۃً ہو سکتی ہے۔

انسان یہاں پیدائشی رعیت (Born subject) ہے۔ رعیت ہونا یا نہ ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا کچھ اور ہونا اسکے امکان میں نہیں ہے۔ الہٰذا یہ خود اپنے لیے طریق زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

یہ کسی چیز کا مالک نہیں ہے کہ اپنی ملک میں تصرف کرنے کا ضابطہ خود بنائے۔ اس کا جسم اور اس کی ساری قوتیں اللہ کی ملک اور اُس کا عطیہ ہیں، لہٰذا یہ اُن کو خود اپنے منشار کے مطابق استعمال کرنے کا حق دار نہیں ہے، بلکہ جس نے یہ چیزیں اسکو عطا کی ہیں اُسی کی مرضی کے مطابق اسے اُنکو استعمال کرنا چاہئے۔

اسی طرح جو اشیاء اس کے گرد و پیش دنیا میں پائی جاتی ہیں، زمین، جانور، پانی، نباتات، معدنیات وغیرہ، یہ سب اللہ کی ملک ہیں، انسان انکا مالک نہیں ہے، لہٰذا انسان کو ان پر بھی اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ اسے انکے ساتھ اُس قانون کے مطابق برتاؤ کرنا چاہیے جو اصل مالک نے مقرر کیا ہے۔

اسی طرح وہ تمام انسان بھی جو زمین پر بستے ہیں، اور جنکی زندگی ایک دوسرے سے وابستہ ہے

اللہ کی رعیت ہیں۔ لہٰذا انکو اپنے باہمی تعلقات کے بارے میں خود اصول اور ضابطے مقرر کرنیکا حق نہیں ہے۔ اُنکے جملہ تعلقات خدا کے بنائے ہوئے قانون پر مبنی ہونے چاہئیں۔

رہی یہ بات کہ وہ خدا کا قانون کیا ہے؟ تو پیغمبر یہ کہتے ہیں کہ جس ذریعۂ علم کی بنا پر تم تمہیں دُنیا کی اور خود تمہاری یہ حقیقت بتا رہے ہیں، اُسی ذریعۂ علم سے ہم کو خدا کا قانون بھی معلوم ہوا ہے۔ خدا نے خود ہم کو یہ علم دیا ہے اور ہمکو اس بات پر مامور کیا ہے کہ یہ علم تم تک پہنچا دیں۔ لہٰذا تم ہم پر اعتماد کرو۔ ہمیں اپنے بادشاہ کا نمائندہ تسلیم کرو۔ اور ہم سے اس کا مستند قانون لو۔

پھر پیغمبر ہم سے کہتے ہیں کہ یہ جو تم بظاہر دیکھتے ہو کہ سلطنت عالم کا سارا کاروبار ایک نظم کے ساتھ چل رہا ہے مگر نہ خود سلطان نظر آتا ہے نہ اُسکے کارپرداز کام کرتے دکھائی دیتے ہیں، اور یہ جو تم ایک طرح کی خود مختاری اپنے اندر محسوس کرتے ہو کہ جس طرح چاہو کام کرو، مالکانہ روش بھی اختیار کر سکتے ہو، اور اصل مالک کے سوا دوسروں کے سامنے بھی اطاعت و بندگی میں سر جھکا سکتے ہو، ہر صورت میں تم کو رزق ملتا ہے، وسائل کار بہم پہنچتے ہیں، اور بغاوت کی سزا فوراً نہیں دی جاتی، یہ سب دراصل تمہاری آزمائش کے لیے ہے۔ چونکہ تم کو عقل، قوت مشاہدہ، قوت استنباط، اور قوت انتخاب دی گئی ہے، اس لیے مالک نے اپنے آپکو اور اپنے نظام سلطنت کو تمہاری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ وہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے کہ تم اپنی ان قوتوں سے کس طرح کام لیتے ہو۔ اس نے تم کو انتخاب کی آزادی (Freedom of choice) دی ہے اور سمجھ بوجھ عطا کی ہے۔ اگر تم اپنی رعیت ہونے کی حیثیت کو سمجھو، اور برضا و رغبت اس حیثیت کو اختیار کرو بغیر اسکے کہ تم پر اس حیثیت میں رہنے کے لیے کوئی جبر ہو، تو اپنے مالک کی آزمائش میں کامیاب ہو گے۔ اور اگر رعیت ہونے کی حیثیت کو نہ سمجھو، یا سمجھنے کے باوجود باغیانہ روش اختیار کرو تو امتحان میں ناکام ہو جاؤ گے۔ اسی امتحان کی غرض سے تم کو دنیا میں کچھ اختیارات دیے گئے ہیں، دنیا کی بہت سی چیزیں تمہارے قبضہ قدرت میں دی

گئی ہیں، اور تم کو عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے۔

اسکے بعد پیغمبر ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ دنیوی زندگی چونکہ امتحان کی مہلت ہے لہٰذا یہاں نہ حساب ہے، نہ جزا نہ سزا[1]۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عمل نیک کا انعام نہیں ہے۔ وہ اس بات کی علامت نہیں ہے کہ اللہ تم سے خوش ہے یا جو کچھ تم کر رہے ہو وہ درست ہے۔ بلکہ دراصل وہ محض امتحان کا سامان ہے۔ مال، دولت، اولاد، خدام، حکومت، اسباب زندگی، یہ سب وہ چیزیں ہیں جو تم کو امتحان کی غرض سے دی جاتی ہیں تاکہ تم ان پر کام کر کے دکھاؤ اور اپنی اچھی یا بری قابلیتوں کا اظہار کرو۔ اسی طرح جو تکلیفیں، نقصانات، مصائب وغیرہ آتے ہیں وہ بھی کسی عمل بد کی سزا نہیں ہیں

---

[1] اس سلسلہ میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ عالم جس میں ہم اس وقت ہیں دراصل عالم طبیعی ہے نہ کہ عالم اخلاقی۔ جن قوانین پر کائنات کا موجودہ نظام چل رہا ہے وہ اخلاقی قوانین نہیں ہیں بلکہ طبیعی قوانین ہیں۔ اسلیے موجودہ نظام کائنات میں اعمال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مترتب نہیں ہو سکتے۔ وہ اگر مترتب ہو سکتے ہیں تو صرف اُسی حد تک جس حد تک کہ قوانین طبیعی ان کو مترتب ہونے کا موقع دیں، ورنہ جہاں قوانین طبیعی ان کے ظہور کے لیے سازگار نہ ہوں وہاں ان کا ظاہر ہونا محال ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اس فعل کے اخلاقی نتیجہ کا مترتب ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ قوانین طبیعی اُس کا سراغ لگنے اور اسکے اوپر جرم ثابت ہونے اور اس پر اخلاقی سزا کے نافذ ہوتے میں مددگار رہیں۔ اگر وہ مددگار نہ ہوں تو کوئی اخلاقی نتیجہ سرے سے مترتب ہوگا ہی نہیں۔ اور اگر وہ سازگاری کریں بھی، تب بھی اس فعل کے پورے اخلاقی نتائج مرتب نہ ہو سکیں گے، کیونکہ مقتول کے عوض قاتل کا محض قتل کر دیا جانا اُس فعل کا پورا اخلاقی نتیجہ نہیں ہے جس کا اس نے ارتکاب کیا تھا۔ اسی لیے یہ دنیا دار الجزا نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی۔ دار الجزا ہونے کے لیے ایک ایسا نظام عالم درکار ہے جس میں موجودہ نظام عالم کے برعکس حکمراں قوانین قوانین اخلاقی ہوں اور قوانین طبیعی محض انکے خادم کی حیثیت رکھتے ہوں۔

بلکہ ان میں سے بعض قانون فطرت کے تحت آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں[1]، اور بعض آزمائش کے ذیل میں آتے ہیں[2]، اور بعض اس وجہ سے پیش آتے ہیں کہ حقیقت کے خلاف رائے قائم کر کے جب تم ایک رویہ اختیار کرتے ہو تو لامحالہ تم کو چوٹ لگتی ہے[3]۔ بہر حال یہ دُنیا دار الجزاء نہیں ہے بلکہ دار الامتحان ہے۔ یہاں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد، قابلِ اخذ یا قابلِ ترک ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں۔ مہلت کی زندگی ختم ہونے کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں تمہارے پورے کارنامے کو جانچ کر فیصلہ کیا جائیگا کہ تم امتحان میں کامیاب ہوئے ہو یا ناکام۔ اور وہاں جس چیز پر کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے وہ یہ ہے کہ اوّلاً تم نے اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکم حقیقی ہونے اور اسکی طرف سے آئی ہوئی تعلیم و ہدایت کے من جانب اللہ ہونے کو پہچانا یا نہیں، اور ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد آزادی انتخاب رکھنے کے باوجود تم نے اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے حکم شرعی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا یا نہیں۔

---

[1] مثلاً زنا کرنے والے کا بیماری میں مبتلا ہونا، کہ یہ اس گناہ کی اخلاقی سزا نہیں ہے بلکہ اس کا طبعی نتیجہ ہے۔ اگر وہ علاج کرنے میں کامیاب ہو جائے تو بیماری سے بچ جائیگا مگر اخلاقی سزا سے نہ بچے گا۔ اگر توبہ کرے تو اخلاقی سزا سے بچ جائیگا مگر بیماری دور نہ ہوگی۔

[2] مثلاً کسی شخص کا افلاس میں مبتلا ہونا اسکے حق میں اس امر کی آزمائش ہے کہ وہ اپنی حاجات پوری کرنے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے یا جائز وسائل ہی سے کام لینے پر ثابت قدم رہتا ہے، اور مصائب کے ہجوم میں حق پرستی پر قائم رہتا ہے یا مضطر ہو کر باطل کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔

[3] مثلاً جب انسان اس دنیا کو بے خدا اور اپنے آپکو خود مختار سمجھ کر کام کرتا ہے تو چونکہ فی الواقع نہ دنیا بے خدا ہے اور نہ انسان خود مختار، اسلیے امر واقعی کے خلاف عمل کرنے کی وجہ سے وہ لامحالہ چوٹ کھاتا ہے۔ اسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے آگ کو کھلونا سمجھ کر آپ ہاتھ میں پکڑ لیں تو ہاتھ جل جائیگا کیونکہ آپ نے امر واقعی کے خلاف رویہ اختیار کیا۔

نظریۂ اسلامی کی تنقید

دنیا اور انسان کے متعلق یہ نظریہ جو پیغمبروں نے پیش کیا ہے ایک مکمل نظریہ ہے۔ اسکے تمام اجزاء میں ایک منطقی ربط ہے۔ کوئی جزء دوسرے جزء سے متناقض نہیں ہے۔ اس سے تمام واقعات عالم کی پوری توجیہ اور تمام آثار کائنات کی پوری تعبیر ملتی ہے۔ کوئی ایک چیز بھی مشاہدہ یا تجربہ میں ایسی نہیں آتی جس کی توجیہ اس نظریہ سے نہ کی جاسکتی ہو۔ لہٰذا یہ علمی نظریہ (Scientific theory) کی تعریف میں آتا ہے۔

پھر کوئی مشاہدہ یا تجربہ آج تک ایسا نہیں ہوا جس سے یہ نظریہ ٹوٹ جاتا ہو۔ لہٰذا یہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ٹوٹے ہوئے نظریات میں اسکو شمار نہیں کیا جاسکتا۔

پھر نظام عالم کا جو مشاہدہ ہم کرتے ہیں اُس سے یہ نظریہ نہایت اغلب (Most probable) نظر آتا ہے۔ کائنات میں جو زبردست تنظیم پائی جاتی ہے اُسکو دیکھ کر یہ کہنا زیادہ قرین دانش ہے کہ اس کا کوئی ناظم ہے، بہ نسبت اسکے کہ کوئی ناظم نہیں ہے۔ اسی طرح اس تنظیم کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا زیادہ معقول ہے کہ یہ مرکزی نظام ہے اور ایک ہی مختار کل اس کا ناظم ہے، بہ نسبت اسکے کہ یہ لامرکزی نظام ہے اور بہت سے ناظموں کے ماتحت چل رہا ہے۔ اسی طرح جو حکمت کی شان اس کائنات کے نظام میں علانیہ محسوس ہوتی ہے اُسے دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا زیادہ قریب از عقل ہے کہ یہ حکیمانہ اور بامقصد نظام ہے، بہ نسبت اسکے کہ بے مقصد ہے اور محض ایک بچے کا کھیل ہے۔

پھر جب ہم اس حیثیت سے غور کرتے ہیں کہ اگر واقعی یہ نظام کائنات ایک سلطنت ہے اور انسان اس نظام کا ایک جزء ہے تو یہ بات ہم کو سراسر معقول معلوم ہوتی ہے کہ اس نظام میں انسان کی خود مختاری وغیر ذمہ داری کے لیے کوئی جگہ نہ ہونی چاہیے اور اس کا صحیح مقام رعیت ہی کا ہونا چاہیے اس لحاظ سے یہ ہم کو نہایت معقول (Most reasonable) نظریہ معلوم ہوتا ہے۔

پھر جب عملی نقطۂ نظر سے ہم دیکھتے ہیں تو یہ بالکل ایک قابلِ عمل (Practicable) نظریہ

ہے۔ زندگی کی ایک پوری اسکیم اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس نظریہ پر مبنی ہے۔ فلسفہ اور اخلاق کے لیے، علوم و فنون کے لیے، ادب اور ہنر کے لیے، تمدن و معاشرت کے لیے، معیشت اور کاروبار کے لیے، سیاست اور انتظام مملکت کے لیے، صلح و جنگ اور بین الاقوامی تعلقات کے لیے، غرض زندگی کے ہر پہلو اور ہر ضرورت کے لیے یہ ایک مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے اور کسی شعبۂ زندگی میں بھی انسان کو اپنا رویہ متعین کرنے کے لیے اس نظریہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

اب ہمیں صرف یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ اس نظریہ سے دنیا کی زندگی میں کس قسم کا رویہ بنتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں۔

انفرادی زندگی میں یہ نظریہ دوسرے جاہلی نظریات کے برعکس ایک نہایت ذمہ دارانہ اور نہایت منضبط (Well-disciplined) رویہ پیدا کرتا ہے۔ اس نظریہ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے جسم اور اسکی طاقتوں کو اور دنیا اور اسکی کسی چیز کو بھی اپنی ملک سمجھ کر خود مختارانہ استعمال نہ کرے بلکہ خدا کی ملک سمجھ کر صرف اُسکے قانون کی پابندی میں استعمال کرے۔ ہر چیز کو جو اسے حاصل ہے خدا کی امانت بھی سمجھے اور یہ سمجھتے ہوئے اس میں تصرف کرے کہ مجھے اس امانت کا پورا حساب دینا ہے، اور حساب بھی اسکو دینا ہے جسکی نظر سے میرا کوئی فعل بلکہ کوئی دل میں چھپا ہوا ارادہ تک پوشیدہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص ہر حال میں ایک ضابطہ کا پابند ہو گا۔ وہ خواہشات کی بندگی میں کبھی شتر بے مہار نہیں بن سکتا۔ وہ ظالم اور خائن نہیں ہو سکتا۔ اُسکی سیرت پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ وہ ضابطہ کی پابندی کے لیے کسی خارجی دباؤ کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے نفس میں ایک زبردست اخلاقی انضباط پیدا ہو جاتا ہے جو اُسے اُن مواقع پر بھی راستی اور حق پر قائم رکھتا ہے جہاں اُسے کسی دنیوی طاقت کی باز پرس کا خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ خدا کا خوف اور امانت کا احساس وہ چیز ہے جس سے بڑھ کر سوسائیٹی کو قابل اعتماد افراد فراہم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ تصور میں نہیں آسکتا۔

مزید برآں یہ نظریہ آدمی کو نہ صرف سعی و جہد کا آدمی بناتا ہے بلکہ اس کی سعی و جہد کو خود غرضی، نفس پرستی، یا قوم پرستی کے بجائے حق پرستی اور بلند تر اخلاقی مقاصد کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ جو شخص اپنے متعلق یہ رائے رکھتا ہو کہ میں دنیا میں بے کار نہیں آیا ہوں بلکہ خدا نے مجھے کام کرنے کے لیے یہاں بھیجا ہے، اور میری زندگی اپنے لیے یا اپنے دوسرے متعلقین کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کام کے لیے ہے جس میں خدا کی رضا ہو، اور میں یونہی چھوڑا نہ جاؤں گا بلکہ مجھ سے پورا حساب لیا جائے گا کہ میں نے اپنے وقت کا اور اپنی قوتوں کا کتنا اور کس طرح استعمال کیا، ایسے شخص سے زیادہ کوشش کرنے والا اور نتیجہ خیز اور صحیح کوشش کرنے والا آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ نظریہ ایسے بہتر افراد پیدا کرتا ہے کہ ان سے بہتر انفرادی رویہ کا تصور کرنا مشکل ہے۔

اب اجتماعی پہلو میں دیکھیے۔

سب سے پہلے تو یہ نظریہ انسانی اجتماع کی بنیاد بدل دیتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے تمام انسان خدا کی رعیت ہیں۔ رعیت ہونے کی حیثیت سے سب کے حقوق یکساں، سب کی حیثیت یکساں، اور سب کے لیے مواقع یکساں۔ کسی شخص، کسی خاندان، کسی طبقہ، کسی قوم، کسی نسل کے لیے دوسرے انسانوں پر نہ کسی قسم کی برتری و فوقیت ہے نہ امتیازی حقوق۔ اس طرح انسان پر انسان کی حاکمیت اور فضیلت کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور وہ تمام خرابیاں یک لخت دور ہو جاتی ہیں جو بادشاہی، جاگیرداری، نوابی (Aristocracy) اور برہمنیت و پاپائیت سے پیدا ہوتی ہیں۔

پھر یہ چیز قبائلی، قومی، نسلی، جغرافی اور لونی تعصبات کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے جن کی بدولت دنیا میں سب سے زیادہ خوں ریزیاں ہوئی ہیں۔ اس نظریہ کی رو سے تمام روئے زمین خدا کا ملک ہے، تمام انسان آدم کی اولاد اور خدا کے بندے ہیں، اور فضیلت کی بنیاد نسل و نسب، مال و دولت یا رنگ کی سپیدی و سرخی پر نہیں بلکہ اخلاق کی پاکیزگی اور خدا کے خوف پر ہے۔ جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے

والا اور صلاح و تقویٰ پر عمل کرنے والا ہے وہی سب سے افضل ہے۔

اسی طرح انسان اور انسان کے درمیان اجتماعی ربط و تعلق یا فرق و امتیاز کی بنا بھی اس نظریہ میں کلیتہً تبدیل کر دی گئی ہے۔ انسان نے اپنی ایجاد سے جن چیزوں کو اجتماع و افتراق کی بنا ٹھیرایا ہے وہ انسانیت کو بے شمار حصوں میں تقسیم کرتی ہیں اور اُن حصوں کے درمیان ناقابلِ عبور دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں کیونکہ نسل، یا وطن، یا قومیت یا رنگ وہ چیزیں نہیں ہیں جنکو آدمی تبدیل کر سکتا ہو اور ایک گروہ میں سے دوسرے گروہ میں جا سکتا ہو۔ برعکس اسکے یہ نظریہ انسان اور انسان کے درمیان اجتماع و افتراق کی بنا خدا کی بندگی اور اس کے قانون کی پیروی پر رکھتا ہے۔ جو لوگ مخلوقات کی بندگی چھوڑ کر خدا کی بندگی اختیار کر لیں اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا واحد قانون تسلیم کر لیں وہ سب ایک جماعت ہیں، اور جو ایسا نہ کریں وہ دوسری جماعت۔ اس طرح تمام اختلافات مٹ کر صرف ایک اختلاف باقی رہ جاتا ہے اور وہ اختلاف بھی قابلِ عبور ہے۔ کیونکہ ہر وقت ایک شخص کے لیے ممکن ہے کہ اپنا عقیدہ اور طرزِ زندگی بدل دے اور ایک جماعت سے دوسری جماعت میں چلا جائے۔

اِن تمام بنیادی اصلاحات کے بعد جو سوسائٹی اِس نظریہ پر مبنی ہے اُسکی ذہنیت، اسپرٹ اور اجتماعی تعمیر (Social structure) بالکل بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں اسٹیٹ انسان کی حاکمیت پر نہیں بلکہ خدا کی حاکمیت پر بنتا ہے۔ حکومت خدا کی ہوتی ہے، قانون خدا کا ہوتا ہے، اور انسان صرف خدا کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہ چیز اول تو ان ساری خرابیوں کو دور کر دیتی ہے جو انسان پر انسان کی حکومت اور انسان کی قانون سازی سے پیدا ہوتی ہیں۔ پھر ایک عظیم الشان فرق جو اس نظریہ پر اسٹیٹ بننے سے واقع ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اسٹیٹ کے پورے نظام میں عبادت اور تقویٰ کی اسپرٹ پھیل جاتی ہے۔ راعی اور رعیت دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کی حکومت میں ہیں اور ہمارا معاملہ براہِ راست اُس خدا سے ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے۔ ٹیکس دینے والا یہ سمجھ کر

ٹیکس دیتا ہے کہ وہ خدا کو ٹیکس دے رہا ہے، اور ٹیکس لینے والے اور اس ٹیکس کو خرچ کرنے والے یہ سمجھتے ہوئے کام کرتے ہیں کہ یہ مال خدا کا مال ہے اور ہم امین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ایک سپاہی سے لے کر ایک جج اور گورنر تک ہر کارندۂ حکومت اپنی ڈیوٹی اُسی ذہنیت کے ساتھ انجام دیتا ہے جس ذہنیت کے ساتھ وہ نماز پڑھتا ہے۔ دونوں کام اسکے لیے یکساں عبادت ہیں۔ اور دونوں میں وہی ایک تقویٰ اور خشیت کی روح درکار ہے۔ باشندے اپنے اندر سے جن لوگوں کو خدا کی نیابت کا کام انجام دینے کے لیے چنتے ہیں اُن میں سب سے پہلے جو صفت تلاش کی جاتی ہے وہ خوفِ خدا اور امانت و صداقت کی صفت ہے۔ اس طرح سطح پر وہ لوگ اُبھر کر آتے ہیں اور اختیارات اُنکے ہاتھوں میں دیے جاتے ہیں جو سوسائٹی میں سب سے بہتر اخلاق کے حامل ہوتے ہیں۔

تمدن و معاشرت میں بھی یہ نظریہ وہی تقویٰ اور طہارت اخلاق کی اسپرٹ پھیلا دیتا ہے اس میں نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی ہوتی ہے، ہر ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان خدا کا واسطہ حائل ہوتا ہے، اور خدا کا قانون دونوں کے تعلقات کو منضبط کرتا ہے۔ یہ قانون چونکہ اُس نے بنایا ہے جو تمام نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض سے پاک ہے، اور علیم و حکیم بھی ہے، اس لیے اس میں فتنے کا ہر دروازہ اور ظلم کا ہر راستہ بند کیا گیا ہے اور انسانی فطرت کے ہر پہلو اور اسکی ہر ضرورت کی رعایت کی گئی ہے۔

یہاں اتنا موقع نہیں کہ میں اُس پُوری اجتماعی عمارت کا نقشہ پیش کروں جو اس نظریہ پر بنتی ہے۔ مگر جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اُس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیغمبروں نے جو نظریہ کائنات و انسان پیش کیا ہے وہ کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی نہیں کہ یہ محض کاغذ پر ایک خیالی نقشہ (Utopia) ہو، بلکہ تاریخ میں اس نظریہ پر ایک اجتماعی نظام اور ایک اسٹیٹ بنا کر دکھایا جا چکا ہے، اور تاریخ شاہد ہے کہ جیسے

افراد اس نظریہ پر تیار کیے گئے تھے نہ اُن سے بہتر افراد کبھی روئے زمین پر پائے گئے اور نہ اُس اسٹیٹ سے بڑھ کر کوئی اسٹیٹ انسان کے لیے رحمت ثابت ہوا۔ اس کے افراد میں اپنی اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک صحرائی عورت کو زنا سے حمل ہو جاتا ہے، وہ جانتی ہے کہ مجھے اس جرم کی سزا سنگساری جیسی ہولناک سزا ہے، مگر وہ خود چل کر آتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ اس پر سزا نافذ کی جائے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ وضع حمل کے بعد آئیو اور بغیر کسی مچلکہ وضمانت کے اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وضع حمل کے بعد وہ پھر صحرا سے آتی ہے اور سزا دیئے جانے کی درخواست کرتی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ بچہ کو دودھ پلا اور جب دودھ پلانے کی مدت ختم ہو جائے تب آئیو۔ پھر وہ صحرا کی طرف واپس چلی جاتی ہے اور کوئی پولیس کی نگرانی اس پر نہیں ہوتی۔ رضاعت کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ پھر آکر التجا کرتی ہے کہ اب اسے سزا دے کر اُس گناہ سے پاک کر دیا جائے جو اس سے سرزد ہو چکا ہے۔ چنانچہ اُسے سنگسار کیا جاتا ہے، اور جب وہ مرجاتی ہے تو اُس کے لیے دعائے رحمت کی جاتی ہے، اور جب ایک شخص کی زبان سے اس کے حق میں اتفاقاً یہ کلمہ نکل جاتا ہے کہ کیسی بے حیا عورت تھی تو جواب میں فرمایا جاتا ہے کہ خدا کی قسم اس نے ایسی توبہ کی تھی کہ اگر ناجائز محصول لینے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔ یہ تو اس سوسائٹی کے افراد کا حال تھا۔ اور اس اسٹیٹ کا حال یہ تھا کہ جس حکومت کی آمدنی کروڑوں روپے تک پہنچی ہوئی تھی، اور جس کے خزانے ایران و شام و مصر کی دولت سے معمور ہو رہے تھے اس کا صدر صرف ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ تنخواہ لیتا تھا اور اس کے شہریوں میں ڈھونڈے سے بھی بمشکل کوئی ایسا شخص ملتا تھا جو خیرات لینے کا مستحق ہو۔

اس تجربہ کے بعد بھی اگر کسی شخص کو یہ اطمینان حاصل نہ ہو کہ انبیاء نے نظام کائنات کی حقیقت اور اس میں انسان کی حیثیت کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ حق ہے تو ایسے شخص کے اطمینان کے

سے بیچ کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہے، کیونکہ خدا اور فرشتوں اور آخرت کی زندگی کا براہِ راست عینی مشاہدہ تم سے بہرحال حاصل نہیں ہو سکتا۔ جہاں مشاہدہ ممکن نہ ہو وہاں تجربہ سے بڑھ کر صحت کا کوئی دوسرا معیار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک طبیب بیمار کے اندر مشاہدہ کر کے یہ نہیں دیکھ سکتا کہ فی الواقع سسٹم میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے تو وہ مختلف دوائیں دے کر دیکھتا ہے۔ اور جو دوا اس اندھیری کوٹھڑی میں ٹھیک نشانہ پر جا کر بیٹھتی ہے اُس کا مرض کو دور کر دینا ہی اس بات پر قطعی دلیل ہوتا ہے کہ سسٹم میں فی الواقع جو خرابی تھی یہ دوا اُسکے عین مطابق تھی۔ اسی طرح جب انسانی زندگی کی کل کسی دوسرے نظریہ سے درست نہیں ہوتی اور صرف انبیاء کے نظریہ ہی سے درست ہوتی ہے تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظریہ حقیقت کے مطابق ہے، فی الواقع یہ کائنات اللہ کی سلطنت ہی ہے اور واقعی اس زندگی کے بعد ایک زندگی ہے جس میں انسان کو اپنے کارنامۂ حیاتِ دنیوی کا حساب دینا ہے۔

ضرورت مترجمین

عربی۔ فارسی۔ انگریزی سے براہِ راست شستہ و رفتہ سلیس اردو میں ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ جو مناسب اجرت پر علمی ادبی تاریخی نیز متفرق علوم و فنون کی کتابوں اور رسائل کے مضامین کا ترجمہ کر سکیں۔ کسی ایک زبان اور اردو کا جاننا کافی ہے۔ علمی قابلیت نیز تجربہ کے متعلق تفصیل سے جواب آنا ضروری ہے

پتہ ذیل پر خط و کتابت کریں:

شباب ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۶ ۱۳ بمبئی نمبر ۲

سرورِ عالم

[یہ تقریر ۱۰/ اپریل ۱۹۴۱ء کو نشرگاہ لاہور سے نشر کی گئی تھی اور آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے یہاں نقل کی جاتی ہے]

ہم مسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "سرورِ عالم" کہتے ہیں۔ سیدھی سادی زبان میں اس کا مطلب ہے "دنیا کا سردار"۔ ہندی میں اسکا ترجمہ "جگت گرو" ہوگا اور انگریزی میں (Leader of the world) بظاہر یہ بہت بڑا خطاب ہے، مگر جس بلند پایہ ہستی کو یہ خطاب دیا گیا ہے اُس کا کارنامہ واقعی ایسا ہے کہ اُس کو سرورِ عالم کہنا مبالغہ نہیں عین حقیقت ہے۔

دیکھیے! کسی شخص کو دنیا کا لیڈر کہنے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہونی چاہیے کہ اُس نے کسی خاص قوم، یا نسل یا طبقہ کی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کیا ہو۔ ایک محب وطن یا ایک قوم پرست لیڈر کی آپ اس حیثیت سے جتنی چاہیں قدر کریں کہ اُس نے اپنے لوگوں کی بڑی خدمت کی، لیکن اگر آپ اسکے ہم وطن یا ہم قوم نہیں ہیں تو وہ آپکا لیڈر بہرحال نہیں ہوسکتا۔ جس شخص کی محبت، خیرخواہی اور کارگزاری سب کچھ چین یا ہسپانیہ تک محدود ہو، مجھ ہندوستانی کو اس سے کیا تعلق کہ میں اسے اپنا لیڈر مانوں؟ بلکہ اگر وہ اپنی قوم کو دوسروں سے افضل ٹھیراتا ہو اور دوسروں کو گرا کر اپنی قوم کو چڑھانا چاہتا ہو تو میں اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں۔ ساری قوموں کے انسان کسی ایک شخص کو اپنا لیڈر صرف اسی صورت میں مان سکتے ہیں جبکہ اسکی نگاہ میں سب قومیں اور سب آدمی یکساں ہوں، وہ سب کا یکساں خیرخواہ ہو، اور اپنی خیرخواہی میں کسی طرح ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔

دوسری اہم شرط جو دنیا کا لیڈر ہونے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ایسے اصول پیش کیے ہوں جو تمام دنیا کے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہوں اور جن میں انسانی زندگی کے تمام اہم مسائل کا حل موجود ہو۔ لیڈر کے معنی ہی رہنما کے ہیں۔ لیڈر کی ضرورت ہوتی ہی اس لیے ہے کہ وہ فلاح اور بہتری کا راستہ بتائے۔ لہٰذا دنیا کا لیڈر وہی ہو سکتا ہے جو ساری دنیا کے انسانوں کو ایسا طریقہ بتائے جس میں سب کی فلاح ہو۔

تیسری لازمی شرط دنیا کا لیڈر ہونے کے لیے یہ ہے کہ اسکی رہنمائی کسی خاص زمانے کے لیے نہ ہو بلکہ ہر زمانے اور ہر حال میں یکساں مفید، یکساں صحیح اور یکساں قابلِ پیروی ہو۔ جس لیڈر کی رہنمائی ایک زمانہ میں کارآمد اور دوسرے زمانہ میں بیکار ہو اسکو دنیا کا لیڈر نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کا لیڈر تو وہی ہے کہ دنیا جب تک قائم رہے اسکی رہنمائی بھی کارآمد رہے۔

چوتھی اہم ترین شرط یہ ہے کہ اس نے صرف اصول پیش کرنے ہی پر اکتفا نہ کی ہو بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کو زندگی میں عملاً جاری کر کے دکھایا ہو اور انکی بنیاد پر ایک جیتی جاگتی سوسائیٹی پیدا کر دی ہو۔ محض اصول پیش کرنے والا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر (Thinker) ہو سکتا ہے، لیڈر نہیں ہو سکتا۔ لیڈر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اصولوں کو عمل میں لا کر دکھائے۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ یہ چاروں شرطیں اس ہستی میں کہاں تک پائی جاتی ہیں جس کو ہم "سرورِ عالم" کہتے ہیں۔

پہلی شرط کو پہلے لیجیے۔ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ایک ہی نظر میں محسوس کر لینگے کہ یہ کسی قوم پرست یا محبِ وطن کی زندگی نہیں ہے بلکہ ایک محبِ انسانیت اور ایک عالمگیر نظریہ رکھنے والے انسان کی زندگی ہے۔ اُن کی نگاہ میں تمام انسان یکساں تھے۔ کسی خاندان، کسی طبقے، کسی قوم، کسی نسل، یا کسی ملک کے خاص مفاد سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ امیر اور غریب

اور نیچ اور نیچ، کالے اور گورے، عرب اور غیر عرب، مشرقی اور مغربی، سامی اور آرین، سب کو وہ اس حیثیت سے دیکھتے تھے کہ یہ سب ایک ہی انسانی نسل کے افراد ہیں۔ اُنکی زبان سے تمام عمر کوئی ایک لفظ یا ایک فقرہ بھی ایسا نہ نکلا، اور نہ زندگی بھر میں کوئی کام انہوں نے ایسا کیا جس سے یہ شبہ کیا جاسکتا ہو کہ انہیں ایک طبقۂ انسانی کے مقابلہ میں دوسرے طبقۂ انسانی کے مفاد سے زیادہ تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی زندگی ہی میں حبشی، ایرانی، رومی، مصری اور اسرائیلی اُسی طرح اُنکے رفیقِ کار بنے جس طرح عرب، اور اُنکے بعد زمین کے ہر گوشے میں ہر نسل اور ہر قوم کے انسانوں نے اُنکو اُسی طرح اپنا رہنما تسلیم کیا جس طرح خود اُنکی اپنی قوم نے۔ یہ اسی خالص انسانیت ہی کا کرشمہ تو ہے کہ آج آپ ایک ہندوستانی کی زبان سے اُس شخص کی تعریف سُن رہے ہیں جو صدیوں پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا۔

اب دوسری اور تیسری شرط کو ایک ساتھ لیجیے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص قوموں اور مخصوص ملکوں کے وقتی اور مقامی مسائل سے بحث کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی پوری قوت دنیا میں انسانیت کے اُس بڑے مسئلے کو حل کرنے پر صرف کر دی جس سے تمام انسانوں کے سارے چھوٹے چھوٹے مسائل خود حل ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑا مسئلہ کیا ہے؟ وہ صرف یہ ہے کہ کائنات کا نظام فی الواقع جس اصول پر قائم ہے، انسان کی زندگی کا نظام بھی اُسکے مطابق ہو، کیونکہ انسان اس کائنات کا ایک جُز ہے اور جُز کی حرکت کا کُل کے خلاف ہونا ہی خرابی کا موجب ہے۔ اگر آپ اس بات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اسکی آسان صورت یہ ہے کہ اپنی نگاہ کو ذرا کوشش کر کے زمان اور مکان کی قیود سے آزاد کر لیجیے اور پورے کرۂ زمین پر اس طرح نظر ڈالیے کہ ابتدا سے آج تک اور آئندہ غیر محدود زمانہ تک بسنے والے تمام انسان بیک وقت آپکے سامنے ہوں۔ پھر دیکھیے کہ انسان کی زندگی میں خرابی کی جتنی صورتیں پیدا ہوئی ہیں یا ہونی ممکن ہیں اُن سب کی جڑ کیا ہے یا کیا ہو سکتی ہے۔ اس سوال پر آپ جتنا غور کرینگے، جتنی چھان بین اور تحقیق کرینگے، حاصل یہی نکلے گا کہ انسان کی خدا سے بغاوت تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسلیے کہ خدا سے

باغی ہو کر انسان لازمی طور پر دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت اختیار کرتا ہے: یا تو وہ اپنے آپ کو خود مختار اور غیر ذمہ دار سمجھ کر من مانی کارروائیاں کرنے لگتا ہے اور یہ چیز اُسے ظالم بنا دیتی ہے، یا پھر وہ خدا کے سوا دوسروں کے حکم کے آگے سر جھکانے لگتا ہے اور اس سے دنیا میں فساد کی بے شمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ خدا سے بے پروا ہو کر یہ خرابیاں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا چونکہ حقیقت کے خلاف ہے اس لیے اس کا نتیجہ برا نکلتا ہے۔ یہ ساری کائنات فی الواقع خدا کی سلطنت ہے۔ زمین، سورج، چاند، ہوا، پانی، روشنی، سب خدا کی ملک ہیں۔ اور انسان اس سلطنت میں پیدائشی بندے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پوری سلطنت جس نظام پر قائم ہے اور جس نظام پر چل رہی ہے، اگر انسان اسکا ایک جزء ہونے کے باوجود اس سے مختلف رویہ اختیار کرے تو لامحالہ اس کا ایسا رویہ تباہ کن نتائج ہی پیدا کریگا۔ اس کا یہ سمجھنا کہ مجھ سے اوپر کوئی مقتدر اعلیٰ نہیں ہے جسکے سامنے میں جوابدہ ہوں، واقعہ کے خلاف ہے اسلیے جب وہ خود مختار بن کر غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر کام کرتا ہے اور اپنا قانون زندگی آپ تجویز کرتا ہے تو نتیجہ برا نکلتا ہے۔ اسی طرح اُس کا خدا کے سوا کسی اور کو صاحب اختیار و اقتدار ماننا اور اس سے خوف یا لالچ رکھنا اور اسکی آقائی کے آگے جھک جانا بھی حقیقت کے خلاف ہے، کیونکہ فی الحقیقت اس پوری کائنات میں خدا کے سوا کوئی بھی یہ حیثیت نہیں رکھتا، لہٰذا اس کا نتیجہ بھی برا ہی نکلتا ہے۔ صحیح نتیجہ برآمد ہونے کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ زمین اور آسمان میں جو حقیقی حکومت ہے، انسان اسکے سامنے سر جھکا دے، اپنی خودی و خودسری کو اُسکے آگے تسلیم کر دے، اپنی اطاعت اور بندگی کو اسکے لیے خالص کر دے، اور اپنی زندگی کا ضابطہ و قانون خود بنانے یا دوسروں سے لینے کے بجائے اُس سے لے۔

یہ بنیادی اصلاح کی تجویز ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے لیے پیش کی ہے

یہ مشرق اور مغرب کی قید سے آزاد ہے۔ روئے زمین میں جہاں جہاں انسان آباد ہیں، یہی ایک اصلاحی تجویز انکی زندگی کی بگڑی ہوئی کل کو درست کر سکتی ہے۔ اور یہ ماضی و مستقبل کی قید سے بھی آزاد ہے۔ ڈیڑھ ہزار برس پہلے یہ جتنی صحیح اور کارگر تھی اتنی ہی آج بھی ہے اور اتنی ہی دس ہزار برس بعد بھی ہوگی۔

اب آخری شرط باقی رہ جاتی ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف خیالی نقشہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ اس نقشہ پر ایک زندہ سوسائٹی پیدا کرکے دکھا دی۔ انہوں نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں لاکھوں انسانوں کو خدا کی حکومت کے آگے سر اطاعت جھکانے پر آمادہ کر لیا، اُن سے خود پرستی بھی چھڑوادی اور خدا کے سوا دوسروں کی بندگی بھی، پھر اُنکو جمع کرکے خالص خدا کی بندگی پر ایک نیا نظام اخلاق، نیا نظام تمدن، نیا نظام معیشت، اور نیا نظام حکومت بنایا، اور تمام دنیا کے سامنے اس بات کا عملی مظاہرہ کر دیا کہ جو اصول وہ پیش کر رہے ہیں اس پر کیسی زندگی بنتی ہے اور دوسرے اصولوں کی زندگی کے مقابلہ میں وہ کتنی اچھی، کتنی پاکیزہ اور کتنی صالح ہے۔

یہ وہ کارنامہ ہے جسکی بنا پر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرورِ عالم یا دنیا کا لیڈر کہتے ہیں۔ اُن کا یہ کام کسی خاص قوم کے لیے نہ تھا، تمام انسانوں کے لیے تھا۔ یہ انسانیت کی مشترک میراث ہے جس میں کسی کا حق کسی دوسرے سے کم یا زیادہ نہیں ہے۔ جو چاہے اس میراث سے فائدہ اٹھائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اسکے خلاف کسی کو تعصب رکھنے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

ہماری ایجنسی!

لکھنؤ میں ہماری ایجنسی احترام اینڈ سنز جنرل مرچنٹس کے پاس ہے۔

اہل لکھنؤ کو ہماری جو مطبوعات درکار ہوں۔ وہ ایجنسی سے طلب کر سکتے ہیں۔

(منیجر)

اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاحِ عالم

از جناب حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی

ریاست (state) ایک مخصوص قسم کی ہیئت اجتماعیہ کا نام ہے۔ ہیئت اجتماعیہ کے وجود میں آنیکی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ پہلی صورت حیوانیت کے طبعی ارتقار کی ایک منزل ہے۔ جس طرح متعفن اشیاء میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں، جس طرح آب و گل اور تخم کے اجتماع سے خودرو پودے پیدا ہو جاتے ہیں اور جس طرح تیز و تند ہواؤں کے عمل سے ریگستانوں میں ریگ کے ٹیلے بنجاتے ہیں، اسی طرح زمانہ کے آغوش میں محض جذبات حیوانی اور ماحول کے مقتضار سے مختلف اور متفرق افراد انسانی میں ایک ہیئتہ اجتماعیہ پیدا ہو جاتی ہے جسکو وہ اپنی قومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی ہیئت اجتماعیہ میں بعض خصوصیات کا اضافہ کرکے اسکو ریاست کا نام دیدیا جاتا ہے۔ لیکن پیدا ہوتی ہے یہ اسی حیوانیت سے جس سے ایسی قوموں کے کل حرکات و سکنات ناشی ہوتے ہیں۔ ایسی قومیں اگر بھیڑوں سے جمہوریت کی تعلیم حاصل کرتی ہیں تو بھیڑیوں سے آمریت کا سبق سیکھتی ہیں۔ انکے علم و عمل دونوں کا ذریعہ ماحول، زمانہ، جذبات اور خواہشوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

راحت و فلاح، قیام و بقار ایسی جماعتوں اور قوموں کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتی۔ انکی زندگی انکے لیے موت سے تلخ تر ہوتی ہے اور انکی موت پر نہ آسمان روتا ہے نہ زمین آنسو نکالتی ہیں۔ اور بہت تھوڑے عرصہ میں وہ اپنے ہی اعمال کے ثمرہ کے طور پر موت و فنا کے قعر عمیق میں دھکیل دی جاتی ہیں۔ وہ زمانہ کے بحر زخار میں بلبلوں کی طرح پیدا ہوتی ہیں اور اپنی مختصر عمر

پریشانی، حیرانی اور مصائب میں گذار کر ساحل سے سر ٹکرا کر فنا ہو جاتی ہیں۔ نہ اُن کا کوئی مقصد حیات ہوتا ہے نہ مرام زندگی۔ نہ انکو اپنے نقطۂ آغاز کا علم ہوتا ہے نہ نقطۂ انجام کا۔ نہ وہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا	اُنکے پاس دل ہیں مگر وہ اُن سے سمجھتے نہیں ہیں
وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا	انکے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں ہیں
وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا	انکے پاس کان ہیں مگر وہ اُن سے سُنتے نہیں ہیں
أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ	وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

یورپ کے "ترقی یافتہ حیوانات"[1]، اُنکے سیاسی و اجتماعی تصورات اور اُنکے نتائج مثال کے لیے بہت کافی ہیں۔ ورنہ دراصل تو امت مسلمہ کے سوا ہر قوم، اور ریاست کے اسلامی تصور کے سوا ہر تصور اسی حیوانیت کی پیداوار ہوتا ہے۔ حال اور ماضی دونوں میں یہ چیز صاف صاف نظر آتی ہے اور عقل و تجربہ دونوں اس کی کھلی ہوئی شہادت دیتے ہیں کہ اجتماع و سیاست کے متعلق جتنے نظریات آج تک دنیا کے سامنے پیش کیے گئے ہیں اور جن پر دنیا نے عمل کیا ہے ان میں سے ایک بھی بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اور راحت و طمانیت کا سبب نہیں بن سکا اور نہ بن سکتا ہے۔ جمہوریت ہو یا آمریت، سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت، سب اسی حیوانیت اور بہیمیت کے مظاہر ہیں۔ انکی شکلیں مختلف ہیں مگر حقیقت سب کی ایک ہے یعنی خدائے بے نیاز سے بے نیازی و بغاوت اختیار کر کے اُس انسان کی حکومت قائم کرنا جسکی حقیقت ان ارباب تحقیق کے نزدیک یہ ہے کہ وہ بس ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔

[1] یہ لقب خود اہلِ یورپ کا محبوب و پسندیدہ ہے، اسلیے کہ انکے نزدیک انسان کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وہ ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔

انسان کی فرمانروائی (Sovereignty) بنیاد ہے کل غیر اسلامی سیاسی تصورات و نظریات کی۔ یہ بنیاد اس قدر کمزور، مہمل، خلافِ عقل اور احمقانہ ہے کہ اسکے اوپر جو عمارت بھی تعمیر کی جائیگی وہ نہ صرف خود بہت جلد منہدم ہو جائیگی بلکہ تعمیر کرنے والوں کو بھی اپنے ملبہ میں ابدالآباد کے لیے دفن کر دیگی۔ چنانچہ آج یورپ کے ترقی یافتہ حیوانات میں حیوانیت و بہیمت کا جو مقابلہ ہو رہا ہے اور جس طرح بنی آدم کے خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے وہ طبعی نتیجہ ہے اسی انسانی حکومت و فرمانروائی نظریہ حیات، اور غیر اسلامی طرزِ تخیل کا۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ — خشکی اور تری میں فساد پھوٹ پڑا ہے لوگوں کے اپنے کرتوتوں سے۔

تہذیب مغرب کے شجرہ خبیثہ میں پھل آنے شروع ہو گئے ہیں۔ ان مہذب حیوانات کو یہ کڑوے پھل کھانے پڑینگے اور پیٹ بھر کر کھانے پڑینگے۔

ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيُّهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ لَآكِلُونَ مِنْ شَجَرٍ مِنْ زَقُّومٍ فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ — پھر اے تکذیب کرنے والے گمراہ لوگو! تم کو زقوم کھانا پڑے گا اور پیٹ بھر کر کھانا ہوگا۔

اس زقوم تلخ کا بیج تو تم نے ہی بویا تھا، اب اس کے پھل کھانے سے کیوں گھبراتے ہو؟ یہ سب اسی تہذیب کا نتیجہ ہے جسکو پھیلانے کے لیے تم نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کر دیا تھا یہ سب اسی انسانی فرمانروائی ہی کا تو اثر ہے جس کا قائم کرنا تمہاری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ پھر اسکی تعمیر ہی اسکی تخریب کی ضامن ہے اور تم کو بھی آج تباہی میں اس کا ساتھ دینا چاہیے جس طرح زندگی میں اس کا ساتھ دیتے رہے ہو۔ فکیف آسیٰ علی قوم کافرین۔

خدا جانے یہ کہاں کا انصاف اور کس عقل کا اقتضاء ہے کہ انسانوں کے ایک بہت بڑے

گروہ کو انہی سے کے مثل ایک انسان یا ایک چھوٹی سی انسانی جماعت کا محکوم بنا دیا جائے اور انسان کو انسان کا فرمانروا قرار دیدیا جائے ؟ پھر عقل تو یہ بتاتی ہے کہ انسانی فہم قوانین کو سمجھ تو سکتی ہے، مگر انکو بنا نہیں سکتی۔ فہم قانون اور شے ہے اور وضع قانون بالکل ایک دوسری شے۔ خلاقِ عقول نے انسانی عقل کو یہ طاقت ہی نہیں عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنے لیے یا دوسروں کے لیے قوانین وضع کرسکے۔ ہم نے تکرارِ مشاہدہ سے معلوم کیا کہ پانی گیہوں کے لیے مفید ہے۔ اس لیے ہم نے یہ قانون بنا لیا کہ گیہوں میں پانی دینا چاہیے۔ لیکن درحقیقت ہم نے کوئی قانون وضع نہیں کیا ہے بلکہ جو قانون قدرت تھا اُسے صرف دریافت کیا ہے۔ ان قوانین کی وضع پر انسان کا قادر نہ ہو بالکل بدیہی چیز اور مسلمہ مسئلہ ہے۔

قانون کی دوسری قسم وہ ضوابط ہیں جو کسی فرد یا جماعت کے حق کو وجود میں لاتے ہیں یا اسکی حفاظت کرتے ہیں یا اسکو سلب کیتے ہیں۔ سیاسی مباحث میں لفظ قانون زیادہ تر اسی مفہوم میں مستعمل ہے۔ اس قسم کے قوانین کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ ان کا وضع کرنا انسانی عقل کی قدرت سے باہر ہے۔ اس عدم قدرت سے ہماری یہ مراد ہے کہ چونکہ انسانی عقل کی طاقت انکو صحیح وضع کرنے سے قاصر ہے اسلیے اس قسم کے قوانین اگر بنائے جائینگے تو وہ یقیناً غلط ہونگے۔ یعنی انکی وضع کی حقیقی غرض و غایت ان سے ہرگز نہ پوری ہوسکے گی بلکہ وہ انسانوں کے لیے بجائے مفید ہونے کے مضرت رساں ثابت ہونگے۔ اس مقصد کے اثبات کے لیے مندرجہ ذیل دلائل کافی ہیں :

(۱) سطور بالا میں ہم ذکر کرچکے ہیں کہ قانون اُس ضابطہ کا نام ہے جو کسی فرد یا جماعت کے حق کو وجود میں لائے یا اسکی حفاظت کرے یا اسکو سلب کرے۔ قانون کی یہ تعریف بہت جامع و مانع ہے۔ اس تعریف پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وضع قانون کے لیے واضع کو

مندرجہ ذیل امور کا علم ضروری و لابدی ہے:

(۱) حق کا مفہوم (۲) مختلف اشخاص کی صحیح فطرت اور قوت تاثر کا علم تا کہ قانون کی تاثیرات کا صحیح اندازہ کیا جا سکے (۳) ان سب جزئیات کا علم جو قانون کے دائرۂ عمل میں آنے والے ہیں تا کہ انکے قدر مشترک کو صحیح طور پر قانون میں داخل کیا جا سکے۔

حق کا مفہوم کیا ہے؟ اسکی صحیح تعیین سے انسانی عقل اپنے عجز کا ثبوت دے چکی ہے ازمنۂ قدیمہ میں طاقت اور حق مترادف سمجھے جاتے تھے۔ جسکی لاٹھی اسکی بھینس پرانی مثل ہے اور آج بھی اسی اصول پر عمل ہو رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اب اسکی تعبیر کے لیے مہذب اور شستہ الفاظ اختیار کر لیے گئے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرنیکے لیے صرف دو ہی راستے ملتے ہیں۔ ایک طبعی طریقہ دوسرا رسمی طریقہ۔ اگر ہم طبعی قوانین کو پیش نظر رکھ کر خالص سائنٹفک نقطۂ نظر سے حق کے مفہوم کو تلاش کرتے ہیں تو بقاء اصلح Survival of the fittest کا اصول ہماری رہنمائی کرتا ہے اور حق اور طاقت دونوں مترادف ٹھہرتے ہیں۔ اور اگر رسم و رواج یا بقول آسٹن جماعت کے اخلاقی تصور کی روشنی میں اسکا چہرہ دیکھیں تو بھی جسکی لاٹھی اسکی بھینس ہی کی مثل حق کا عنوان نظر آتی ہے۔ (دیکھو جان آسٹن کی کتاب Jurisprudence)۔ بلکہ اس صورت میں چونکہ جماعت کا اخلاقی تصور ایک تغیر پذیر شے ہے اس لیے حق کا مفہوم اور بھی زیادہ غیر متعین ہو جاتا ہے۔ الغرض یہ سوال کہ وہ کونسی شے ہے جسکی بنا پر کسی انسان کے دوسرے انسان کے افعال پر اثر انداز ہونے کو عقلاً جائز کہا جا سکتا ہے، اب تک ناقابل حل ہے۔ اس لیے کہ اس کا صرف ایک جواب پیش کیا گیا ہے اور مادی طرز استنتاج سے صرف وہی جواب ہو سکتا ہے یعنی "طاقت و قدرت"۔ مگر انسان کی عقل اور فطرت دونوں اس جواب کو صحیح ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور دونوں اسکو غلط و گمراہ کن قرار دیتی ہیں۔ لہذا بالآخر یہ ماننا پڑیگا کہ یہ سوال ابھی تک

لاینحل ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ڈاکوؤں کا گروہ جو سلب و نہب کی طاقت رکھتا ہے، محض طاقت کی بنا پر اسکے ان افعال کو کوئی عاقل جائز نہیں قرار دے سکتا۔

رہا ان سب اشخاص کی صحیح فطرت اور جہت تاثر کا علم اور ان کل جزئیات کا علم جو قانون کے تحت میں داخل ہونے والی ہیں تو یہ اور بھی ناممکن ہے۔ اولاً اس لیے کہ اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے، اور دوسرے کے اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ استقراء ہے جو علم یقینی نہیں پیدا کر سکتا۔ ثانیاً اس لیے کہ انسان احوال کا غلام ہوتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات سے اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی فطرت کو اپنی ہی فطرت پر قیاس کر لیتا ہے اور علیٰ ہذا اسکے سامنے جو افراد و جزئیات موجود ہوتے ہیں انہیں پر آئندہ جزئیات کو قیاس کر لیتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی ساخت کے تمام قوانین اسی قسم کی کمزوریوں سے لبریز ہیں۔ اور نہ صرف انکی جامعیت معرض زوال میں ہے بلکہ انکی افادیت بھی غیر متعین ہے۔

الغرض وضع قانون کے لیے جن چیزوں کا علم ضروری و لابدی ہے ان میں سے ایک کا علم بھی انسان نہیں حاصل کر سکتا جسکا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ وہ قانون وضع کرنے سے قاصر ہے۔

(۲) قانون کی جو تعریف بھی کیجیے ہر صورت میں یہ ماننا پڑیگا کہ قانون ایک ایسے اصول کا نام ہے جو انسان کے خیالات، اخلاق یا اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کے صرف یہی تین اجزاء ہیں، اس لیے جو قانون بھی وضع کیا جائیگا اسکا تعلق یا تو انسانی خیالات سے ہوگا یا اسکے اخلاق سے یا اسکے اعمال و افعال سے۔ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جن سے انسان خود متاثر ہوتا ہے اور اسدرجہ متاثر ہوتا ہے کہ بالکل انہی کے تابع رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ان اجزاء زندگی کے لیے وہ خود کوئی قانون کسطرح وضع کر سکتا ہے؟ قانون وضع کرنیکے معنی تو یہی ہونگے کہ زندگی کے یہ اجزاء ثلاثہ واضع قانون کے تابع ہوں، مگر جبکہ واضع قانون خود ان کا تابع ہے تو یہ اُس کے تابع

کیسے ہو سکتے ہیں؟ بنا بریں یہ ناممکن ہے کہ انسان اپنے خیالات، اعمال، یا اخلاق، کے لیے کوئی قانون وضع کر سکے۔ دراصل جو چیز قانون کی شکل میں اسکے ذہن میں آتی ہے وہ ایک فطری اثر اور نتیجہ ہوتا ہے انہیں اجزا ثلثہ میں سے کسی گذشتہ یا موجودہ جزر کا یا کل اجزا کا۔

(۳) ایک انسان کو بدو طفولیت سے کسی ایسے مقام پر قید کر دیا جائے جہاں کسی دوسرے انسان کی صحبت اس کو میسر نہ ہو سکے اور تعلیم و تعلم کے کل ذرائع اس کے لیے مسدود کر دیئے جائیں تو ایسا آدمی جوان بلکہ بوڑھا ہو کر بھی قطعاً لایعقل اور جاہل محض رہیگا اور دوسروں کے لیے تو بڑی بات ہے اپنی انفرادی زندگی کے لیے بھی کوئی قانون وضع نہیں کر سکیگا۔ البتہ چند قوانین پر عمل پیرا ضرور ہوگا۔ ان قوانین میں سے بعض تو وہ ہونگے جن پر وہ جبلّی طور پر محض مجبورانہ عامل ہوگا مثلاً اشتہا کے وقت غذا کھانا، پیاس کے وقت پانی پی لینا، سردی و گرمی سے بچنے کا انتظام کرنا۔ اور بعض قوانین وہ ہونگے جو طبعی قوانین سے اس نے مستنبط کیے ہونگے۔ بہر حال وہ کوئی قانون وضع نہیں کر سکتا صرف استنباط کر سکتا ہے۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی عقل کو فطرتاً یہ قوت نہیں دی گئی ہے کہ وہ کوئی قانون وضع کر سکے۔ البتہ استنباط قوانین کی قدرت اسکو عطا کی گئی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان کی تعلیم و تربیت جب کی جاتی ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ جب اسکو معلوم شدہ قوانین بتائے جاتے ہیں اور طبعی قوانین کی جانب اسکی توجہ منعطف کرائی جاتی ہے تو وہ ان قوانین کو سیکھتا ہے اور اسکے ساتھ ہی ساتھ ان قوانین سے دوسرے قوانین مستنبط بھی کر لیتا ہے۔ اسی استنباط کو مدعیان عقل و دانش اپنی خوش فہمی سے وضع قانون سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اسکی حقیقت محض استنباط ہے۔

واضح رہے کہ تعلیم و تربیت انسان کی فطری قوتوں کو نشو و نما تو دے سکتی ہے لیکن اس میں کوئی جدید قوت پیدا نہیں کر سکتی۔ اسلیے جب وضع قانون کی قوت انسان میں فطری طور پر

موجود ہی نہیں ہے تو تعلیم و تربیت کی بہتر سے بہتر صورت بھی اس میں اس قدرت کی تخلیق نہیں کر سکتی۔ اب یہ امر بالکل صاف ہو گیا کہ وضع قانون کا حق مخصوص ہے اس خلاقِ عظیم کے ساتھ جس نے انسان، اسکی فطرت، اسکے اعمال اور افعال سب کو پیدا کیا ہے۔ وہی ان سب چیزوں کا کماحقہٗ علم رکھ سکتا ہے اور وہی ان کے لیے قانون وضع کر سکتا ہے۔

پھر جب انسان میں وضع قانون کی قوت ہی نہیں ہے تو وہ اگر اسکی کوشش کریگا تو یقیناً غلطی کریگا اور یقیناً اسکی عقل اس غیر معمولی اور اپنی قوتِ برداشت سے زائد بوجھ کو اٹھانے کی وجہ سے ضعیف ہو کر سخافت و سفاہت کے درجہ تک گر جائیگی۔ اس کا واضح مشاہدہ ہم یورپ کے ترقی یافتہ حیوانات کی حکمت آرائیوں میں کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنی استعداد سے بڑھ کر کام کرنیکا نتیجہ پریشانی تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد کہ انسان کو وضع قانون کی قوت حاصل نہیں ہے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ انسان فرمانروا بھی نہیں بن سکتا۔ یہی وہ خط فاصل ہے جو ابتداء اور بنیاد ہی سے اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست میں فرق و امتیاز پیدا کر دیتا ہے اور اتنا فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ان دونوں میں کسی مقام پر بھی اتصال و اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اسلامی ریاست کا بنیادی اصول غیر اللہ کی فرمانروائی کی نفی کامل اور محض اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی کا کامل اثبات ہے۔ اور غیر اسلامی ریاست کا سنگِ بنیاد انسانی فرمانروائی ہے۔ اسلام لا الٰہ کی تعلیم دے کر ہر غیر اللہ کی فرمانروائی کی نفی کر دیتا ہے اور الا اللہ کی تعلیم دے کر فرمانروائی کو ذات حق سبحانہٗ کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے۔ اس کا بنیادی اصول ہے ان الحکم الا للہ حکومت و فرمانروائی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو پہنچتا ہے۔

(۱) ذالکم اللہ ربکم لہ الملک — وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے بادشاہی صرف اسی کی ہے

(۲) لم یکن لہٗ شریک فی الملک — اسکی بادشاہی میں کوئی اسکا شریک نہیں ہے۔

(۳) الا لہ الخلق والامر خبردار ہو جاؤ اسی کے لیے خلق اور امر دونوں مخصوص ہیں۔

(۴) ولا یشرک فی حکمہ احداً وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں بناتا۔

مندرجہ بالا آیات اور انکے علاوہ اور متعدد کثیر آیات اس چیز کو واضح کرتی ہیں کہ اسلام غیر اللہ کی حکمرانی قطعاً ناجائز قرار دیتا ہے اور اسکو کسی حالت میں بھی روا نہیں رکھتا۔ صرف اسلامی ریاست ہی کا نہیں خود اسلام کا سنگ بنیاد بھی یہی اصول ہے۔ اسلام نام ہی ہے حکومت الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی میں داخل ہو جانیکا۔ اس لیے اس اصول کو چھوڑ کر اور غیر اللہ کی فرمانروائی کو جائز قرار دینے کے بعد سرے سے اسلام کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ افسوس اور حیرت ہے ان زعماء ملت پر جو چیخ چیخ کر مسلمانوں کو جمہوریت اور مشترک وطنی حکومت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اسلام کا رشتہ انسانی فرمانروائی سے جوڑتے ہیں۔

اسلامی نظام حکومت کے برعکس سیاست و ریاست کے متعلق جسقدر غیر اسلامی نظریات اب تک پیش کیے گئے ہیں اور جسقدر قیامت تک پیش کیے جائینگے ان سب میں انسانی فرمانروائی کا نظریہ مشترک اور اہم ترین جزو ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں ہم نے اصولی حیثیت سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ چیز سرے سے غلط ہے اور یہ کہ فرمانروائی کا حق مخصوص بذات حق سبحانہٗ ہے۔ انسانی فرمانروائی کے ابطال کے بعد ہر غیر اسلامی سیاسی نظریہ کا باطل ہونا قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے خواہ وہ جمہوریت ہو یا ضطائیت یا دنیا کا اور کوئی سیاسی نظریہ۔ اس لیے اب اسکی حاجت تو نہیں ہے کہ ہر ایک غیر اسلامی سیاسی نظریہ کو علحدہ علحدہ باطل کیا جائے۔ تاہم مزید توضیح اور اتمام حجت کے لیے ہم ان سب پر علحدہ علحدہ بھی تنقید کر کے انکی غلطی قطعی طور پر واضح کیے دیتے ہیں تاکہ اس دور کشمکش میں جب کہ نظریات کا تصادم نہایت شدت کے ساتھ صرف ذہنوں، زبانوں اور کاغذوں ہی پر نہیں بلکہ جنگ کے میدانوں میں بھی ہو رہا ہے لوگ صحیح مقصد کا تعین کر سکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ

خدا سے بے نیاز ہو کر جو نظریہ بھی قائم کیا گیا ہے ایک لعنت ہے جس سے جس قدر جلد چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اسی قدر بہتر ہے اور عالم کی صلاح و فلاح کا ایک اور صرف ایک ذریعہ یہی ہے کہ وہ اسلام کے سیاسی نظریے کو قبول کرے یعنی غیر اللہ کی فرمانروائی کو مٹا کر محض اللہ تعالیٰ کی حکومت و فرمانروائی قبول کرے۔

تاریخی پہلو

ریاست جو سب سے اہم اجتماعی ادارہ ہے اسکی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس سوال کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں اور یورپ کے فلاسفہ کے اس مسئلہ پر مختلف اقوال و خیالات ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ خاندان اولین معاشرہ ہے جو دنیا میں پیدا ہوا اور اس قسم کے مختلف معاشروں کے باہمی اجتماع سے طبعی طور پر ریاست وجود میں آگئی۔ کوئی کہتا ہے کہ خوف و دہشت کے جذبہ سے متاثر ہو کر مختلف اور منتشر انسانی افراد ریاست کو وجود میں لانے پر مجبور ہو گئے کسی کا قول ہے کہ ریاست افراد انسانی میں ایک اجتماعی معاہدہ (Social contract) کا نتیجہ ہے۔ غرض اس سلسلہ میں بکثرت اور مختلف باتیں کہی جاتی ہیں اور ان سب کا محور ایک خیال ہے یعنی حقیقت انسانی کے متعلق یہ مفروضہ کہ وہ ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک جس طرح بھیڑ بکری، گائے، بھینس وغیرہ کے افعال و حرکات انکے ضروریات و ماحول کے لحاظ سے ہوتے ہیں اسی طرح انسانی افعال بھی انہی چیزوں کے تابع ہوتے ہیں۔ مقصد سب کا یہی ہے محض بیانات کا فرق ہے۔ اور یہ فرق بھی اس لیے ہے کہ کسی نے انسان کی بالکل ابتدائی (مفروضہ) حالت سے ریاست کی تاریخ کی ابتدا کی ہے اور کسی نے بعض درمیانی مدارج سے اسکو شروع کیا ہے۔

قرآن مجید اگرچہ فن تاریخ کی کتاب نہیں ہے اور نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کوئی مورخ تھے، لیکن چونکہ شرف و فلاح انسانی سے اس مسئلہ کا تعلق ہے اسلیے اسلام نے اس

مسئلہ کے تاریخی پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ قرآن مجید کا بیان یہ ہے کہ انسان دنیا میں خلافتِ الٰہی کی نعمت اپنے ساتھ لے کر آیا تھا بلکہ تخلیق آدم علیہ السلام کا مقصد ہی خلافت الٰہیہ کا قیام تھا۔ اس مرتبۂ عظمیٰ کے ساتھ انسان کو اس کی ابتدار آفرینش ہی میں نوازا گیا اور سب سے پہلے خلیفۃ اللہ فی الارض حضرت آدم علیہ السلام ہیں جو دنیا کے سب سے پہلے انسان بھی تھے۔ یہ ہے ہیئتہ اجتماعیہ کے وجود میں آنے کی دوسری صورت جو اول الذکر صورت سے بالکل متضاد ہے اور جس کی بنیاد عقلی و فطری اصول اور تشریعی و الٰہی احکام و علوم پر قائم ہے۔

لیکن اسلام اس کا منکر نہیں ہے کہ ریاست نے اپنے ارتقائی مدارج طبعی و حیوانی منہاج پر طے کیے ہیں۔ بلاشبہ ایسا ہوا ہے۔ مگر ریاست کی حقیقی ابتدار اس صورت سے نہیں ہوئی ہے بلکہ اولادِ آدم علیہ السلام کے پھیلنے کے بعد جذبات اور ماحول، نفس اور شیطان کے وساوس کا شکار ہو کر ایک کثیر انسانی جماعت نے ریاست کے اسلامی تصور کو بھلا دیا اور غیر اسلامی یعنی غیر انسانی طریق پر ریاست و حکومت کی بنیادیں قائم کرنا شروع کیں۔ اس قسم کی حیوانی ریاستوں کی تاریخ اور ان کے وجود میں آنے کے اسباب بلاشبہ وہی ہیں جو یورپ کے فلاسفہ ذکر کرتے ہیں۔

خیر و شر اس عالم میں پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ اسیلیے ریاست کے تصور کے دو سلسلے ابتدار آفرینشِ انسان سے لے کر آج تک جاری رہے ہیں۔ ایک تو ریاست کا اسلامی تصور اور دوسرا غیر اسلامی تصور۔ ایک خدائی حکومت کا تصور دوسرا حیوانی حکومت کا تصور۔ ایک خالص اصولی ریاست کا تخیل دوسرا جذبات، اور ہوا و ہوس کی ریاست کا تخیل۔ کل انبیار و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم اسی حکومت الٰہی کی تعلیم و تبلیغ کے لیے تشریف لائے۔ لیکن اس کا واضح تفصیلی اور مکمل ترین خاکہ محض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بنی نوع انسان کے سامنے علمی و عملی صورت میں پیش کیا گیا اور کسی نبی نے اسکی اتنی واضح اور مکمل شکل کبھی نہیں پیش کی تھی۔

الحاصل اسلامی اور غیر اسلامی ریاستوں کا اختلاف محض اصول اور خاکہ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ انکی روحیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متباین ہیں۔ اسلامی ریاست کی روح عبدیت اور اتباع امر الٰہی ہے اور غیر اسلامی ریاست کی روح طغیان اور اتباع ہوا۔ پھر ظاہر ہے کہ جس ریاست کی بنیاد کسی عقلی اصول اور اخلاقی ضابطہ پر قائم نہ ہو بلکہ محض خواہشاتِ نفس پر، خواہ ان خواہشات کا محرک جذبۂ حُبِ جاہ واقتدار ہو یا خوف وہراس، بہرحال اس میں شرکت کرنے والوں کو کبھی راحت وفلاح میسر نہیں ہوسکتی اور نہ وہ کبھی مطمئن رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ اور موجودہ دور کے واقعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر سیاسی نظریے آجتک دنیا کے سامنے آئے وہ سب تجربے سے غلط اور نقصان رساں ہی ثابت ہوئے اور ان نظریوں کو قبول کرنے والے بہت جلد خود ان سے متنفر ہوگئے حتیٰ کہ جس طرح پہلے وہ انکے محاسن کی تبلیغ کرتے تھے اس سے زیادہ انکے معائب کی تبلیغ میں کوشاں ہوئے۔

اس بیان سے یہ ثابت ہوگیا ہوگا کہ اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست کا تصادم کوئی نیا تصادم نہیں ہے بلکہ ابتدائے آفرینشِ انسان سے کچھ ہی عرصہ کے بعد سے یہ تصادم شروع ہوگیا تھا اور آج تک جاری ہے۔ اسلیے اسوقت سے لیکر اب تک غیر اسلامی ریاست کے جتنے تخیلات پیش کیے گئے ہیں سب ہماری تنقید کے ذیل میں داخل ہیں۔ خواہ وہ ہندوؤں کے دیدوں والی ریاستیں ہوں یا افلاطون کی مثالی ریاست (Ideal state) یا موجودہ دور کی نازی وجمہوری ریاستیں۔ لیکن دورِ گذشتہ کے تصورات پر تنقید کرنا اسوقت بیسود ہے اسلیے ہم صرف موجودہ دور کے سیاسی افکار کے معائب کو واضح کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

موجودہ دور کے سیاسی نظریات کی تقسیم دو اعتبارات سے کی جاسکتی ہے۔

(۱) فرمانروا (یا مقتدرِ اعلیٰ) کی تعیین کے اعتبار سے۔

(۲) معاشی اعتبار سے۔

اعتبار اول کی بنا پر دو نظریے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ آمریت اور جمہوریت دونوں میں فرق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آمریت میں فرمانروا ارادۂ انفرادی (Individual will) ہوتا ہے اور جمہوریت میں ارادۂ اجتماعی (General will)۔ لیکن حق یہ ہے کہ دونوں میں جہاں تک اصول کا تعلق ہے کوئی فرق نہیں ہے۔ عملی صورت میں ضرور کچھ فرق پیدا ہوتا ہے۔ مگر وہ بھی بعض اوقات۔ آمریت میں بھی اجتماعی ارادہ ہی درحقیقت فرمانروا ہوتا ہے جو ایک ڈکٹیٹر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور جمہوریت میں یہی اجتماعی ارادہ اکثریت رکھنے والی پارٹی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جمہوریت بھی درحقیقت جماعتی آمریت (Party-dictatorship) کا نام ہے۔

معاشی اعتبار سے دو قسم کی ریاستیں ہمارے سامنے ہیں، سرمایہ دار ریاست اور اشتراکی ریاست۔ دونوں میں فرق ظاہر ہے۔ اول الذکر میں سرمایہ رکھنے والا طبقہ حکمراں ہوتا ہے اور ثانی الذکر میں مزدور طبقہ فرمانروا ہوتا ہے۔ آئندہ سطور میں ہم ان سب پر علحدہ علحدہ نظر ڈالینگے۔

(باقی)

ضرورت مترجمین

عربی، فارسی، انگریزی سے براہ راست شستہ و رفتہ سلیس اردو میں ترجمہ کرنیوالوں کی ضرورت ہے۔ جو مناسب اجرت پر علمی، ادبی، تاریخی نیز متفرق علوم و فنون کی کتابوں اور رسائل کے مضامین کا ترجمہ کر سکیں۔ کسی ایک زبان اور اردو کا جاننا کافی ہے۔ علمی قابلیت نیز تجربہ کے متعلق تفصیل سے جواب آنا ضروری ہے۔ پتہ ذیل پر خط و کتابت کریں۔

شباب۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۲۶ بمبئی نمبر ۳

زندگی بعدِ موت

[یہ تقریر ۱۴ جون ۱۹۴۱ء کو نشرگاہ لاہور سے نشر کی گئی تھی اور آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے یہاں نقل کی جاتی ہے]

موت کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کیسی ہے؟ یہ سوال حقیقت میں ہمارے علم کی رسائی سے دور ہے۔ ہمارے پاس وہ آنکھیں نہیں ہیں جن سے ہم موت کی سرحد کے اُس پار جھانک کر دیکھ سکیں کہ وہاں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ہمارے پاس وہ کان نہیں ہیں جن سے ہم اُدھر کی کوئی آواز سن سکیں۔ ہم کوئی ایسا آلہ بھی نہیں رکھتے جس کے ذریعہ سے تحقیق کے ساتھ معلوم کیا جا سکے کہ اُدھر کچھ ہے یا کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں تک سائنس کا تعلق ہے، یہ سوال اُسکے دائرے سے قطعی خارج ہے جو شخص سائنس کا نام لیکر کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے، وہ بالکل ایک غیر سائنٹفک بات کہتا ہے۔ سائنس کی رو سے نہ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی زندگی ہے، اور نہ یہ کہ کوئی زندگی نہیں ہے جب تک ہم کوئی یقینی ذریعۂ علم نہیں پاتے کم از کم اس وقت تک تو صحیح سائنٹفک رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم زندگی بعد موت کا نہ انکار کریں نہ اقرار۔

مگر کیا عملی زندگی میں ہم اِس سائنٹفک رویہ کو نباہ سکتے ہیں؟ شائد نہیں ــ بلکہ یقیناً نہیں۔ عقلی حیثیت سے تو یہ ممکن ہے کہ جب ایک چیز کو جاننے کے ذرائع ہمارے پاس نہ ہوں تو اسکے متعلق ہم نفی اور اثبات دونوں سے پرہیز کریں۔ لیکن جب اسی چیز کا تعلق ہماری عملی زندگی سے ہو تو ہمارے لیے اِسکے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ یا تو انکار پر اپنا طرزِ عمل قائم کریں یا اقرار پر۔ مثلاً ایک شخص ہے جس سے آپ واقف نہیں ہیں۔ اگر اُسکے ساتھ آپکا کوئی معاملہ درپیش نہ ہو تب تو آپکے لیے یہ ممکن ہے کہ اسکے ایماندار ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کوئی حکم نہ لگائیں۔ لیکن جب آپکو اس سے معاملہ کرنا ہو تو

آپ مجبور ہیں کہ یا تو اسے ایماندار سمجھ کر معاملہ کریں یا بے ایمان سمجھ کر۔ اپنے ذہن میں آپ ضرور یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جب تک اسکا ایماندار ہونا یا نہ ہونا ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک ہم شک کے ساتھ معاملہ کرینگے۔ مگر اسکی ایمانداری کو مشکوک سمجھتے ہوئے جو معاملہ آپ کرینگے عملاً اسکی صورت وہی تو ہو گی جو اسکی ایمانداری کا انکار کرنے کی صورت میں ہو سکتی تھی۔ لہذا فی الواقع انکار اور اقرار کے درمیان شک کی حالت صرف ذہن ہی میں ہو سکتی ہے۔ عملی رویہ کبھی شک پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اُس کے لیے تو اقرار یا انکار بہرحال ناگزیر ہے۔

یہ بات تھوڑے غور و فکر ہی سے آپکی سمجھ میں آسکتی ہے کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک فلسفیانہ سوال نہیں ہے بلکہ ہماری عملی زندگی سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ دراصل ہمارے اخلاقی رویہ کا سارا انحصار ہی اسی سوال پر ہے۔ اگر میرا یہ خیال ہو کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیوی زندگی ہے اور اسکے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے تو میرا اخلاقی رویہ ایک طرح کا ہوگا۔ اور اگر میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ اسکے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے جس میں مجھے اپنی موجودہ زندگی کے کارنامے کا حساب دینا ہوگا اور وہاں میرا اچھا یا برا انجام میرے یہاں کے اعمال پر منحصر ہوگا تو یقیناً میرا اخلاقی طرزِ عمل بالکل ایک دوسری ہی طرح کا ہوگا۔ اسکی مثال یوں سمجھیے جیسے ایک شخص یہ سمجھتے ہوئے سفر کر رہا ہے کہ اسے بس یہاں سے بمبئی تک جانا ہے اور بمبئی پہنچ کر نہ صرف یہ کہ اس کا سفر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیگا بلکہ وہاں وہ پولیس اور عدالت اور ہر اس طاقت کی دسترس سے باہر ہوگا جو اس سے کسی قسم کی باز پرس کر سکتی ہو۔ برعکس اسکے ایک دوسرا شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہاں سے بمبئی تک تو اسکے سفر کی صرف ایک ہی منزل ہے، اسکے بعد اسے سمندر پار ایک ایسے ملک میں جانا ہوگا جہاں کا بادشاہ وہی ہے جو ہندوستان کا بادشاہ ہے، اور اس بادشاہ کے دفتر میں میرے اُس پورے کارنامہ کا خفیہ ریکارڈ موجود ہے جو میں نے ہندوستان میں انجام دیا ہے، اور وہاں میرے ریکارڈ کو جانچ کر فیصلہ کیا جائیگا کہ میں اپنے کام کے

لحاظ سے کس درجہ کا مستحق ہوں - آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں شخصوں کا طرزِ عمل کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ پہلا شخص صرف یہاں سے بمبئی تک کے سفر کی تیاری کریگا، اور دوسرے کی تیاری بعد کی طویل منزلوں کے لیے بھی ہوگی - پہلا شخص یہ سمجھے گا کہ نفع یا نقصان جو کچھ بھی ہے بمبئی پہنچنے تک ہے، آگے کچھ نہیں - اور دوسرا یہ خیال کریگا کہ اصل نفع و نقصان سفر کے پہلے مرحلہ میں نہیں ہے بلکہ آخری مرحلہ میں ہے - پہلا شخص اپنے افعال کے صرف انہی نتائج پر نظر رکھے گا جو بمبئی تک کے سفر میں نکل سکتے ہیں - لیکن دوسرے شخص کی نگاہ اُن نتائج پر ہوگی جو سمندر پار، دوسرے ملک میں پہنچ کر نکلینگے - ظاہر ہے کہ ان دونوں شخصوں کے طرزِ عمل کا یہ فرق براہِ راست نتیجہ ہے انکی اس رائے کا جو وہ اپنے سفر کی نوعیت کے متعلق رکھتے ہیں - ٹھیک اسی طرح ہماری اخلاقی زندگی میں بھی وہ عقیدہ فیصلہ کن اثر رکھتا ہے جو ہم زندگی بعد موت کے بارے میں رکھتے ہیں - عمل کے میدان میں جو قدم بھی ہم اٹھائینگے اُسکی سمت کا تعین اس بات پر منحصر ہوگا کہ آیا ہم اسی زندگی کو پہلی اور آخری زندگی سمجھ کر کام کر رہے ہیں، یا کسی بعد کی زندگی اور اسکے نتائج کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں - پہلی صورت میں ہمارا قدم ایک سمت میں اٹھیگا اور دوسری صورت میں اسکی سمت بالکل مختلف ہوگی -

اس سے معلوم ہوا کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک عقلی اور فلسفیانہ سوال نہیں ہے بلکہ عملی زندگی کا سوال ہے - اور جب بات یہ ہے تو ہمارے لیے اس معاملہ میں شک اور تردد کے مقام پر ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں - شک کے ساتھ جو رویہ ہم زندگی میں اختیار کرینگے وہ بھی لامحالہ انکار ہی کے رویہ جیسا ہوگا - لہذا ہم بہرحال اس امر کا تعین کرنے پر مجبور ہیں کہ آیا موت کے بعد کوئی اور زندگی ہے یا نہیں - اگر سائنس اس کے تعین میں ہماری مدد نہیں کرتا تو ہمیں عقلی استدلال سے مدد لینی چاہیے -

اچھا تو عقلی استدلال کے لیے ہمارے پاس کیا مواد ہے؟ ہمارے سامنے ایک تو خود انسان ہے، اور دوسرے یہ نظام کائنات - ہم انسان کو اس نظام کائنات کے اندر رکھ کر دیکھینگے کہ جو کچھ انسان میں

ہے آیا اسکے سارے مقتضیات اس نظام میں پورے ہو جاتے ہیں یا کوئی چیز ایسی بچی رہ جاتی ہے جس کے لیے کسی دوسری نوعیت کے نظام کی ضرورت ہو۔

دیکھیے، انسان ایک تو جسم رکھتا ہے جو بہت سے معدنیات، نمکیات، پانی اور گیسوں کا مجموعہ ہے۔ اسکے جواب میں کائنات کے اندر بھی مٹی، پتھر، دھاتیں، نمک، گیسیں، دریا، اور اسی جنس کی دوسری چیزیں موجود ہیں۔ ان چیزوں کو کام کرنے کے لیے جتنے قوانین کی ضرورت ہے وہ سب اس کائنات کے اندر کارفرما ہیں اور جس طرح وہ باہر کی فضا میں پہاڑوں، دریاؤں، اور ہواؤں کو اپنے حصہ کا کام پورا کرنیکا موقع دے رہے ہیں اسی طرح انسانی جسم کو بھی ان قوانین کے تحت کام کرنیکا موقع حاصل ہے۔

پھر انسان ایک ایسا وجود ہے جو گرد و پیش کی چیزوں سے غذا لے کر بڑھتا اور نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ اسی جنس کے درخت، پودے اور گھاس پھونس کائنات میں بھی موجود ہیں، اور وہ قوانین بھی یہاں پائے جاتے ہیں جو نشو و نما پانے والے اجسام کے لیے درکار ہیں۔

پھر انسان ایک زندہ وجود ہے جو اپنے ارادہ سے حرکت کرتا ہے، اپنی غذا خود اپنی کوشش سے فراہم کرتا ہے، اپنے نفس کی آپ حفاظت کرتا ہے، اور اپنی نوع کو باقی رکھنے کا انتظام کرتا ہے۔ کائنات میں اس جنس کی بھی دوسری بہت سی قسمیں موجود ہیں۔ خشکی، تری اور ہوا میں بیشمار حیوانات پائے جاتے ہیں۔ اور وہ قوانین بھی بتمام و کمال یہاں کارفرما ہیں جو ان زندہ ہستیوں کے پورے دائرۂ عمل پر حاوی ہونے کے لیے کافی ہیں۔

ان سب سے اوپر انسان ایک اور نوعیت کا وجود بھی رکھتا ہے جسکو ہم اخلاقی وجود کہتے ہیں۔ اسکے اندر نیکی اور بدی کا شعور ہے، نیک اور بد کی تمیز ہے، نیکی اور بدی کرنے کی قوت ہے، اور اسکی فطرت یہ مطالبہ کرتی ہے کہ نیکی کا اچھا اور بدی کا برا نتیجہ ظاہر ہو۔ وہ ظلم اور انصاف، سچائی اور جھوٹ، حق اور ناحق، رحم اور بے رحمی، احسان اور احسان فراموشی، فیاضی اور بخل، امانت اور خیانت،

اور ایسی ہی مختلف اخلاقی صفات کے درمیان فرق کرتا ہے ۔ یہ صفات عملاً اسکی زندگی میں پائی جاتی ہیں اور یہ محض خیالی چیزیں نہیں ہیں بلکہ بالفعل ان کے اثرات انسانی تمدن پر مترتب ہوتے ہیں ۔ لہذا انسان جس فطرت پر پیدا ہوا ہے اسکا شدت کے ساتھ یہ تقاضا ہے کہ جس طرح اسکے افعال کے طبعی نتائج رونما ہوتے ہیں اُسی طرح اخلاقی نتائج بھی رونما ہوں ۔

مگر نظام کائنات پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھیے کیا اس نظام میں انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح رونما ہو سکتے ہیں ؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں اسکا امکان نہیں ہے ۔ اس لیے کہ یہاں اس کا انتظام ہی نہیں کیا گیا ہے ۔ انسان کے سوا یہاں ، کم از کم ہمارے علم کی حد تک ، کوئی دوسری ایسی مخلوق نہیں پائی جاتی جو اخلاقی وجود رکھتی ہو ۔ سارا نظام کائنات طبعی قوانین کے تحت چل رہا ہے ، اخلاقی قوانین کسی طرف کارفرما نظر نہیں آتے ۔ یہاں روپے میں وزن اور قیمت ہے مگر سچائی میں نہ وزن ہے نہ قیمت ۔ یہاں آم کی گٹھلی سے ہمیشہ آم پیدا ہوتا ہے ، مگر حق پرستی کا بیج بونے والے پر کبھی پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور کبھی ، بلکہ اکثر جوتیوں کی ۔ یہاں مادی عناصر کے لیے مقرر قوانین ہیں جنکے مطابق ہمیشہ مقرر نتائج نکلتے ہیں مگر اخلاقی عناصر کے لیے کوئی مقرر قانون نہیں ہے کہ انکی فعلیت سے ہمیشہ مقرر نتیجہ نکل سکے ۔ طبعی قوانین کی فرمانروائی کے سبب سے اخلاقی نتائج کبھی تو نکل ہی نہیں سکتے ، کبھی نکلتے ہیں تو صرف اُس حد تک جسکی اجازت طبعی قوانین دیدیں ، اور بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ اخلاقی ایک فعل سے ایک خاص نتیجہ نکلنے کا تقاضہ کرتا ہے مگر طبعی قوانین کی مداخلت سے نتیجہ بالکل برعکس نکل آتا ہے ۔ انسان نے خود اپنے تمدنی و سیاسی نظام کے ذریعہ سے تھوڑی سی کوشش اس امر کی کی ہے کہ انسانی اعمال کے اخلاقی نتائج ایک مقرر ضابطہ کے مطابق برآمد ہو سکیں مگر یہ کوشش بہت محدود پیمانہ پر ہے اور بیحد ناقص ہے ۔ ایک طرف طبعی قوانین اسکو محدود اور ناقص بناتے ہیں اور دوسری طرف انسان کی اپنی بہت سی کمزوریاں اِس انتظام کے نقائص میں اور زیادہ اضافہ کرتی ہیں ۔

میں اپنے مدعا کی توضیح چند مثالوں سے کرونگا۔ دیکھیے، ایک شخص اگر کسی دوسرے شخص کا دشمن ہو اور اسکے گھر میں آگ لگادے تو اسکا گھر جل جائیگا۔ یہ اسکے فعل کا طبعی نتیجہ ہے۔ اس کا اخلاقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس شخص کو اتنی ہی سزا ملے جتنا اس نے ایک خاندان کو نقصان پہنچایا ہے۔ مگر اس نتیجہ کا ظاہر ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ آگ لگانے والے کا سُراغ ملے، وہ پولیس کے ہاتھ آسکے، اس پر جرم ثابت ہو، عدالت پوری طرح اندازہ کرسکے کہ آگ لگنے سے اس خاندان کو اور اسکی آئندہ نسلوں کو ٹھیک ٹھیک کتنا نقصان پہنچا ہے، اور پھر انصاف کے ساتھ اس مجرم کو اتنی ہی سزا دے۔ اگر ان شرطوں میں سے کوئی شرط بھی پوری نہ ہو تو اخلاقی نتیجہ یا تو بالکل ہی ظاہر نہ ہوگا یا اس کا صرف ایک تھوڑا سا حصہ ظاہر ہوکر رہ جائیگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے حریف کو برباد کرکے وہ شخص دنیا میں مزے سے پھولتا پھلتا رہے۔

اس سے بڑے پیمانے پر ایک اور مثال لیجیے۔ چند اشخاص اپنی قوم میں اثر پیدا کرلیتے ہیں اور ساری قوم ان کے کہے پر چلنے لگتی ہے۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھاکر وہ لوگوں میں قوم پرستی کا اشتعال اور ملک گیری کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، گرد و پیش کی قوموں سے جنگ چھیڑ دیتے ہیں، لاکھوں آدمیوں کو ہلاک کرتے ہیں، ملک کے ملک تباہ کرڈالتے ہیں، کروڑوں انسانوں کو ذلیل اور پست زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں، اور انسانی تاریخ پر انکی کارروائیوں کا ایسا زبردست اثر پڑتا ہے جس کا سلسلہ آئندہ سینکڑوں برس تک پُشت در پشت اور نسل در نسل پھیلتا چلا جائیگا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ چند اشخاص جس جرم عظیم کے مرتکب ہوئے ہیں اس کی مناسب اور منصفانہ سزا ان کو کبھی اس دنیوی زندگی میں مل سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر ان کی بوٹیاں بھی نوچ ڈالی جائیں، اگر ان کو زندہ جلا ڈالا جائے یا کوئی اور ایسی سزا دی جائے جو انسان کے بس میں ہے، تب بھی کسی طرح وہ اس نقصان کے برابر سزا نہیں پاسکتے جو انہوں نے کروڑہا انسانوں کو اور انکی آئندہ بے شمار نسلوں کو پہنچایا ہے۔ موجودہ نظام

کائنات جن طبعی قوانین پر چل رہا ہے انکے تحت کسی طرح یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے جرم کے برابر سزا پاسکیں۔

اسی طرح اُن نیک انسانوں کو لیجئے جنہوں نے نوعِ انسانی کو حق اور راستی کی تعلیم دی اور ہدایت کی روشنی دکھائی جنکے فیض سے بیشمار انسانی نسلیں صدیوں سے فائدہ اٹھارہی ہیں اور نہ معلوم آئندہ کتنی صدیوں تک اٹھاتی چلی جائینگی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کی خدمات کا پورا صلہ انکو اس دنیا میں مل سکے؟ کیا آپ تصور کرسکتے ہیں کہ موجودہ طبعی قوانین کی حدود کے اندر ایک شخص اپنے اُس عمل کا پورا صلہ حاصل کرسکتا ہے جس کا ردِ عمل اسکے مرنے کے بعد ہزاروں برس تک اور بے شمار انسانوں تک پھیل گیا ہو؟

جیسا کہ میں ابھی بیان کرچکا ہوں، اول تو موجودہ نظامِ کائنات جن قوانینِ قدرت پر چل رہا ہے انکے اندر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مترتب ہوسکیں، دوسرے یہاں چند سال کی زندگی میں انسان جو عمل کرتا ہے اس کے ردِ عمل کا سلسلہ اتنا وسیع ہوتا ہے اور اتنی مدت تک جاری رہتا ہے کہ صرف اسی کے پورے نتائج وصول کرنے کے لیے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس کی زندگی درکار ہے اور موجودہ قوانینِ قدرت کے ماتحت انسان کو اتنی زندگی ملنی ناممکن ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسانی ہستی کے خاکی، عضوی اور حیوانی عناصر کے لیے تو موجودہ طبعی دنیا (Physical world) اور اسکے طبعی قوانین کافی ہیں، مگر اس کے اخلاقی عنصر کے لیے یہ دنیا بالکل ناکافی ہے۔ اس کے لیے ایک دوسرا نظامِ عالم درکار ہے جس میں حکمراں قانون (Governing Law) اخلاق کا قانون ہو، اور طبعی قوانین اس کے ماتحت محض مددگار کی حیثیت سے کام کریں۔ جس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ غیر محدود ہو۔ جس میں وہ تمام اخلاقی نتائج جو یہاں مترتب ہونے سے رہ گئے ہیں یا اُلٹے مترتب ہوئے ہیں، اپنی صحیح صورت میں پوری طرح مترتب ہوسکیں۔ جہاں سونے اور چاندی کے بجائے

نیکی اور صداقت میں وزن اور قیمت ہو۔ جہاں آگ صرف اُس چیز کو جلائے جو اخلاقاً جلنے کی مستحق ہو، جہاں عیش اس کو ملے جو نیک ہو اور مصیبت اسکے حصہ میں آئے جو بد ہو۔ عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے کہ ایسا ایک نظام عالم ضرور ہونا چاہیے۔

جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے، وہ ہم کو صرف "ہونا چاہیے" کی حد تک پہنچا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا واقع میں ایسا کوئی عالم ہے بھی، تو ہماری عقل اور ہمارا علم دونوں اس کا حکم لگانے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور تمہاری فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے فی الواقع وہ ہونے والی ہے اور اسی طرح ہونے والی ہے۔ موجودہ نظام عالم جو طبعی قوانین پر بنا ہے، ایک وقت میں توڑ ڈالا جائیگا۔ اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ پر ہونگی۔ پھر اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے تھے، دوبارہ پیدا کریگا اور بیک وقت ان سب کو اپنے سامنے جمع کریگا۔ وہاں ایک ایک شخص کا، ایک ایک قوم کا، اور پوری انسانیت کا ریکارڈ ہر غلطی اور ہر فروگذاشت کے بغیر محفوظ ہو گا۔ ہر شخص کے ایک ایک عمل کا جتنا ردِعمل دنیا میں ہوا ہے اسکی پوری روداد موجود ہوگی۔ وہ تمام نسلیں گواہوں کے کٹہرے میں حاضر ہونگی جو اس ردِعمل سے متاثر ہوئیں۔ ایک ایک ذرہ جس پر انسان کے اقوال اور افعال کے نقوش ثبت ہوئے، اپنی داستان سنائیگا۔ خود انسان کے ہاتھ اور پاؤں اور آنکھ اور زبان اور تمام اعضاء شہادت دینگے کہ ان سے اس نے کس طرح کام لیا۔ پھر اس روداد پر وہ سب سے بڑا حاکم پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کریگا کہ کون کتنے انعام کا مستحق ہے اور کون کتنی سزا کا۔ یہ انعام اور یہ سزا دونوں چیزیں اتنے بڑے پیمانے پر ہونگی جس کا کوئی اندازہ موجودہ نظام عالم کی محدود مقداروں کے لحاظ سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں وقت اور جگہ کے معیار کچھ اور ہونگے، وہاں کی مقداریں کچھ

اور ہونگی، وہاں کے قوانین قدرت کسی اور قسم کے ہونگے۔ انسان کی جن نیکیوں کے اثرات دنیا میں ہزاروں برس چلتے رہتے ہیں وہاں وہ ان کا بھرپور صلہ وصول کرسکیگا بغیر اسکے کہ موت اور بیماری اور بڑھاپا اسکے عیش کا سلسلہ توڑ سکیں۔ اور اسی طرح انسان کی جن برائیوں کے اثرات دنیا میں ہزارہا برس تک اور بیشمار انسانوں تک پھیلتے رہتے ہیں، وہاں وہ انکی پوری سزا بھگتے گا بغیر اسکے کہ موت اور بیہوشی آکر اسے تکلیف سے بچا سکے۔

ایسی ایک زندگی اور ایسے ایک عالم کو جو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں، مجھے انکے ذہن کی تنگی پر ترس آتا ہے۔ اگر ہمارے موجودہ نظام عالم کا موجودہ قوانین قدرت کے ساتھ موجود ناممکن ہے تو آخر ایک دوسرے نظام عالم کا دوسرے قوانین کے ساتھ وجود میں آنا کیوں ناممکن ہو؟ البتہ یہ بات کہ واقع میں ایسا ضرور ہوگا، تو اس کا تعین نہ دلیل سے ہوسکتا ہے اور نہ علمی ثبوت سے۔ اسکے لیے ایمان بالغیب کی ضرورت ہے۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم

جس میں اسلامی تحریک کے اصول و مقاصد اور طریق کار کی پوری توضیح کی گئی ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کے نصب العین، یعنی حکومت الٰہیہ کے قیام کی جدوجہد کے لیے کس طرز کی جماعت درکار ہے۔ قیمت عہ

دفتر ترجمان القرآن مبارک پارک لاہور سے طلب فرمائیے

مطبوعات

دین و دانش | تالیف مولانا سید محمود علی صاحب سابق پروفیسر رندھیر کالج کپورتھلہ - ضخامت ۵۰۰ صفحہ قیمت مجلد ۱۲ غیر مجلد ۱۰ - کتب خانہ انصاریہ جالندھر -

یہ جدید علم کلام کی ایک اچھی کتاب ہے - اس میں موجودہ زمانہ کے فلسفہ و سائنس سے متاثر لوگوں کو دین اور اسکے اعتقادی مسائل سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے ، اور عام اہلِ کلام کی طرح فاضل مصنف نے تفہیم کی سعی میں ایسی کھینچ تان نہیں کی ہے جس سے نفس معتقداتِ دینی ہی کی شکل بگڑ جائے - ہستئ باری ، وحی ، نبوت ، ملائکہ ، معجزات ، ختم نبوت ، جبر و قدر ، جزا و سزا اور حشر و نشر وغیرہ پر مفصل کلام کرتے ہوئے انہوں نے ہر چیز کو معقول دلائل سے سمجھایا ہے ، اور ملحد فلاسفہ و حکماء کے ساتھ ہندو فلسفہ اور مسیحی فلسفہ کی بھی اچھی طرح تردید کی ہے - لیکن یہ طبعی امر ہے کہ معتقداتِ دینی پر معقولی رنگ میں گفتگو کرتے ہوئے محتاط سے محتاط آدمی کو بھی بسا اوقات ٹھوکر لگ جاتی ہے - جہاں ٹھیٹھ حقیقت کو محدود عقلوں کی رسائی تک لانے میں استدلال کے کمزور سہارے ناکافی ہو جاتے ہیں وہاں ایک صحیح العقیدہ متکلم سے بھی بر سبیل تنزل ایسی باتیں مجبوراً کہہ جاتا ہے جو بجائے خود حقیقت سے بعید ہوتی ہیں - فاضل مصنف کو بھی بعض مقامات پر یہ مشکل پیش آئی ہے - مثلاً مذہب کے ارتقاء کا جو تصور انہوں نے پیش کیا ہے وہ قرآن کے بیان سے بہت ہٹا ہوا ہے اور اسی غلطی کے نتیجہ میں نسخ شرائع کی توجیہ بھی انہوں نے ایسی کی ہے جو قرآن کے خلاف ہے قرآن کی رو سے دین ہرگز ایک ارتقائی چیز نہیں ہے ، اور ظاہر ہے کہ حقیقت کا براہِ راست علم جب وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو تو اس میں ارتقاء کبھی نہیں ہو سکتا - ارتقاء اگر ہو سکتا ہے تو انسان کے اپنے مذہبی تجسس اور اسکے نتائج میں ہو سکتا ہے - مگر مذہب کا جو علم اللہ تعالیٰ خود انبیاء کو عطا کرے اسکو ارتقاء سے کیا تعلق - وہ کوئی

بلند رسیج دریافت ہونے والی چیز تھوڑی ہے کہ تجربات و مشاہدات کی ترقی کے ساتھ ساتھ علم میں اضافہ ہو۔ وہ تو امر واقعی کا کشفی علم ہے جسکی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے آنکھوں سے ہم کسی چیز کو دیکھ لیں۔ اس قسم کا علم جس زمانہ میں جسکو حاصل ہو وہ بعینہٖ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کسی بعد کے زمانہ میں کسی دوسرے کو حاصل ہو۔ اسی لیے نسخ شرائع کی بھی وہ توجیہ صحیح نہیں ہے جو مصنف نے کی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے علوم اور انکی معلومات میں کوئی تفاوت قرآن سے معلوم نہیں ہوتا۔ تمام انبیاء پر ایک ہی علم حق کا فیضان ہوا تھا اور امر حق کے علم میں ان کے درمیان اس حیثیت سے کوئی فرق نہ تھا کہ کسی کا علم کسی کے مقابلہ میں ناقص ہو۔ فرق اگر رہا ہے تو وہ ان احکام میں تھا جو مختلف زمانوں اور مختلف قوموں کے حالات اور انکی مخصوص ضروریات کے لحاظ سے دیے گئے تھے۔ اور ان کے بھی اصول میں فرق نہ تھا بلکہ صرف تفصیلی اشکال میں تھا۔

شیطان اور جن کی حقیقت کے متعلق بھی فاضل موصوف نے جو کچھ لکھا ہے وہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔ ان کے بیان سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ شیاطین اور ملائکہ میں محض نوع کا فرق ہے، جنس ایک ہے، حالانکہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بالکل مختلف جنس کی ہستیاں ہیں۔ ملائکہ قطعی غیر مختار ہیں۔ بخلاف اسکے جن تقریباً انسان کی طرح ذی اختیار ہیں، اُن میں سے جو اللہ کی نافرمانی اختیار کریں ان کا نام شیاطین ہے، اور جو فرمانبرداری اختیار کریں وہ مومن جن ہیں۔

اس قسم کی چند لغزشوں کے باوجود کتاب فی الجملہ بہت مفید ہے اور جو لوگ اسلام کے عقائد کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

دین و آئین | تالیف مولانا سید محمود علی صاحب۔ ضخامت ۲۵۲ صفحات۔ قیمت مجلد ۱۲؍ غیر مجلد ۱۰؍ کتب خانہ انصاریہ، جالندھر۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے اسلام کے ان قوانین کی تشریح کی ہے جن پر آج کل عموماً غیر مسلموں کی طرف سے اعتراضات کیے جاتے ہیں، اور جن میں ترمیم و تغیر کرنے کے لیے دین سے ناواقف اور دنیا

فریفتہ مسلمان بےچین نظر آتے ہیں۔ ابتدا میں انہوں نے نہایت لطیف پیرایہ میں ان لوگوں کے خیال کی تردید کی ہے جو چاہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں دنیا جن جن راہوں پر چل رہی ہے اسلام بھی اسکے پیچھے پیچھے انہی راہوں پر چلتا رہے اور تمام ان غلط کاریوں کے لیے جواز کا فتویٰ دیتا چلا جائے جو نفس کے بندے اور خواہشات کے غلام اختیار کرتے جائیں۔ اسکے بعد انہوں نے نماز، روزہ اور مناسک حج کے متعلق مخالفین کے اعتراضات اور مذبذبین کے بہانوں کا جواب دیتے ہوئے ان عبادات کی روح اور ان کے مصالح و فوائد بیان کیے ہیں۔ پھر سود، تعدد ازدواج، طلاق و خلع، پردہ، قانون دیوانی، قانون وراثت، قانون فوجداری اور قتل مرتد وغیرہ مسائل پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور اسلامی احکام کی حمایت کا حق ادا کر دیا ہے۔

کتاب میں بعض مقامات ایسے نظر آئے جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ فاضل مصنف ان پر نظر ثانی فرمائیں۔ مثلاً اختلاف مراتب نبوت کے بیان میں انکا یہ فرمانا کہ وحی کے ذریعہ سے جو علوم انبیاء علیہم السلام پر القا ہوئے ان میں انبیاء کی ذاتی استعدادوں کے لحاظ سے تفاوت تھا، اور یہ کہ بعض پیغمبروں پر الفاظ کے بغیر صرف خیال نازل ہوا ہے اور الفاظ انہوں نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق خود وضع کیے، اور یہ کہ دو بعض پیغمبروں پر الفاظ بھی القا ہوئے مگر انکی استعداد ایسی قوی نہ تھی کہ صاف اور صریح کو اخذ کر سکتے"، اور یہ کہ خالق کے لیے باپ کا استعارہ اور رسولوں کے لیے اوتار کا لفظ اسی کمی استعداد کے سبب سے بعض انبیاء نے استعمال کیا، یہ سب باتیں نہایت مخدوش ہیں۔ نہ ان کے لیے قرآن میں کوئی بنیاد ملتی ہے اور نہ قیاس عقلی ہی کے لحاظ سے انکو درست کہا جا سکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی کی گئی وہ اس وحی سے مختلف نہ تھی جو نوح علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے نبیوں پر کی گئی تھی۔ رہا قیاس عقلی تو اسکی رو سے ہمارے لیے دو باتوں میں سے کسی ایک کو ماننے بغیر چارہ نہیں، یا تو ہم انسان کو خود اپنی ہدایت کا ذمہ دار سمجھیں اور اس صورت میں نبوت بالکل غیر ضروری ہے، یا ہم اس بات کے قائل ہوں کہ راہِ راست بتانا اللہ کا کام ہے اور اس صورت میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے راہ راست بتانے

کا جو کام اپنے ذمہ لیا ہے اسکو انجام دینے میں اسکی طرف سے کوئی کوتاہی ہو۔ ناقص استعداد کے اشخاص کو پیغام رسانی کے لیے منتخب کرنا، یا پیغام کی تعبیر کو پیغام رسانوں کے اوپر چھوڑ دینا کہ اپنے ذہن سے جس طرح چاہیں مختلف طور پر اسکو تعبیر کریں، یا کسی کے پاس اپنا پیغام غیر واضح صورت میں اور کسی کے پاس واضح صورت میں بھیجنا، ان میں سے جس بات کے بھی آپ قائل ہوں، اس سے اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت و ہدایت پر حرف آتا ہے، اور ان تمام گمراہیوں کی ذمہ داری اللہ کی طرف عائد ہوتی ہے (معاذ اللہ) جو ناقص ہدایت پانے کی وجہ سے انسانوں میں پیدا ہونگی۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے پیغمبر بھیجے ہی اس لیے ہیں کہ قیامت میں باز پرس کے موقع پر کوئی یہ حجت پیش نہ کر سکے کہ آپ نے خود ہی ہم کو راستہ نہ بتایا پھر غلط روی کے ذمہ دار ہم کیسے ہو سکتے ہیں (لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ)۔ لیکن اگر امر واقعہ وہی ہو جو فاضل مصنف نے تجویز کیا ہے تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ اللہ نے لوگوں کے لیے حجت پیش کرنے کی اچھی خاصی گنجائش چھوڑ دی ہے۔

سود کے مسئلہ میں فاضل موصوف نے مسلمانوں کی موجودہ مجبوریوں کو پیش نظر رکھ کر انتہائی متقیانہ احتیاط کے ساتھ ایسے قومی بینک کھولنے کے جواز کی صورت نکالی ہے جن میں محض تاجرانہ اغراض کے لیے سودی لین دین کیا جائے۔ اس تمام بحث کو ہم نے پورے غور کے ساتھ پڑھا۔ کوئی شک نہیں کہ آج کل جو لوگ نہایت بے باکی کے ساتھ سود کی تحلیل کے لیے احکام شرعیہ میں قطع و برید کر رہے ہیں، ان کے مقابلہ میں مولانا محمود علی صاحب کی روش ایک خدا ترس اور ذمہ دار آدمی کی سی روش ہے، اور اس سے بھی انکار نہیں کہ مجبوری و اضطرار کی حالت میں احکام شرعیہ کے اندر وہ تخفیف ہو سکتی ہے جو مولانا نے تجویز فرمائی ہے، مگر بہتر ہوتا کہ اس تجویز کو پیش کرنے کے ساتھ مولانا یہ بھی فرما دیتے کہ مسلمانوں کا کام یہ نہیں ہے کہ اضطرار کی حالت کو برقرار رکھ کر حرام کھاتے اور کھلاتے رہیں بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ دنیا کے اس بگڑے ہوئے نظام کو بدلنے کے لیے جان توڑ جد و جہد کریں جسکی بدولت حرام و حلال کی تمیز مٹ گئی ہے اور جس کے تسلط نے اتنی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ خدا پرست لوگ خدا کی قائم کردہ حدود کی پابندی کر سکیں۔

مفردات القرآن | تالیف مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ - ضخامت ۹۴ صفحات - قیمت ۱۴؍ - دائرہ حمیدیہ - سرائے میر - ضلع اعظم گڈھ -

مولانا مرحوم نے اپنی تفسیر قرآن کے سلسلہ میں قرآن مجید کے بعض اُن الفاظ کی تحقیق کی تھی جن کے مفہوم میں یا تو اختلاف ہو رہا ہے، یا جن کا پورا مفہوم متعین نہیں کیا گیا ہے، یا جنکے معنی کے متعلق غلط فہمیاں عام طور پر شائع ہوگئی ہیں - اس تحقیق کو انہوں نے ایک الگ کتاب کی صورت میں مرتب کرنا شروع کر دیا تھا مگر اسے مکمل نہ کر سکے - متعدد مقامات پر بحث تشنہ رہ گئی ہے اور بعض جگہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے لکھتے لکھتے یکایک چھوڑ دیا ہے - تاہم جتنا بھی لکھا ہے نہایت مفید ہے اور اس سے قرآن مجید کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کو بہت کچھ مدد مل سکتی ہے - کتاب عربی زبان میں ہے -

جمہرۃ البلاغہ | تالیف مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ - ضخامت ۸۸ صفحات - قیمت ۱۲؍ - دائرہ حمیدیہ سرائے میر - ضلع اعظم گڈھ -

قرآن مجید کے معجزہ ہونے پر سب سے پہلی دلیل اسکی بلاغت ہے - اگرچہ اعجاز قرآنی کے اور بھی بہت سے پہلو ہیں، اور ہر پہلو اپنی جداگانہ اہمیت رکھتا ہے، لیکن چونکہ پڑھنے والے کو سب سے پہلے نفس کلام سے سابقہ پیش آتا ہے، اور دوسرے پہلوؤں کی طرف بعد میں نظر جاتی ہے، اسلیے کلام کی بلاغت باقی تمام پہلوؤں پر مقدم ہے - یہی وجہ ہے کہ علماء اسلام نے ابتدا سے قرآن مجید کے وجوہ بلاغت کو نمایاں کرنے کی طرف توجہ کی ہے - اس سلسلہ میں یہ ناگزیر تھا کہ نقد ادبی کے قواعد مدون کیے جاتے، محاسن کلام کا تتبع کیا جاتا اور یہ متعین کیا جاتا کہ کلام کا حسن کن چیزوں میں ہے اور بیان کی خوبی کا معیار کیا ہے - چنانچہ علماء نے یہ کام بھی بہت بڑے پیمانہ پر انجام دیا اور علم البلاغت ایک مستقل فن بن گیا جس پر گزشتہ ایک ہزار سال میں دفتر کے دفتر لکھے جا چکے ہیں - لیکن جس طرح منطق، فلسفہ اور علم الاخلاق وغیرہ میں یونان کے اثر نے مسلمانوں کو تحقیق کی سیدھی راہ سے ہٹا دیا، اسی طرح نقد ادبی میں بھی وہ خصوصیت کے ساتھ

ارسطو سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور مزید برآں عجمی مذاق نے بھی ان پر کافی اثر ڈالا - اسلئے ابتدائی دور کے چند مصنفین کو چھوڑ کر بعد اکثر و بیشتر اہل علم نقد ادبی کے انہی قواعد کی پیروی کرتے چلے گئے جنکی بنا ارسطو نے ڈالی تھی، اور جنکو عجمی تکلفات کے اثر نے اور زیادہ مسخ کر دیا تھا۔ سمجھا یہ جانے لگا کہ کلام کا حسن تشبیہ و استعارہ و مجاز میں ہے اور صنائع و بدائع اسکی زینت ہیں - اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ علم بلاغت کا ارتقار صحیح ذوقِ ادب سے بہت کچھ منحرف ہو گیا اور بلاغت قرآنی کے وجوہ نمایاں ہونے کے بجائے اور زیادہ مستور ہوتے چلے گئے -

مولانا حمید الدین مرحوم کی خدمات میں سے یہ خدمت بھی بڑی قابلِ قدر ہے کہ انہوں نے علم بلاغت کو صدیوں کے یونانی و عجمی اثرات کی گرفت سے نکال کر از سر نو مدون کرنے کی بنا ڈالی - ان کا زیر نظر رسالہ اگرچہ نہایت مختصر ہے، مگر اس میں انکی شانِ تحقیق و اجتہاد کا کمال نظر آتا ہے - انہوں نے اگلوں کی دماغی غلامی سے آزاد ہو کر ان بہت سے غلط نظریوں کی تردید کی ہے جو خواہ مخواہ علم بلاغت کے مسلمات میں داخل ہو گئے تھے - خصوصیت کے ساتھ ارسطو کے وضع کردہ اصولوں کی تو انہوں نے بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ بیخکنی کی ہے - پھر خود اپنے اجتہاد سے بلاغت کے اصول مرتب کیے ہیں جو ذوق ادب اور ذوق عربیت سے بھی مناسبت رکھتے ہیں اور جن سے کلام اللہ کی ادبی خصوصیات بھی زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھی جا سکتی ہیں - ہمارے عربی مدارس میں عموماً فن بلاغت کی تعلیم مختصر المعانی اور مطوّل جیسی کتابوں کے ذریعہ سے دی جاتی ہے جو ایک طرف فن تعلیم کے نقطۂ نظر سے انتہائی ناقص کتابیں ہیں اور دوسری طرف فن بلاغت کے اُس دور کی تصنیف ہیں جبکہ یہ فن عجمیت و یونانیت کی آمیزش سے اپنے انحطاط کی آخری حد کو پہنچ چکا تھا - کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان کتابوں میں طلبہ کا وقت ضائع کرنے کے بجائے مولانا حمید الدین مرحوم کے اس رسالہ کو داخل نصاب کیا جائے -

یہاں یہ کہدینا بھی ضروری ہے کہ مولانا کے اس رسالہ کو جدید طرز پر اصول بلاغت کی تدوین کی راہ میں آخری چیز نہیں بلکہ ابتدائی چیز سمجھنا چاہیے - موجودہ دور میں نقد ادبی کا فن ایک بہت بڑا فن بن چکا ہے

اور ترقی یافتہ زبانوں میں اس پر بہت کام کیا گیا ہے - اگر کوئی صاحب ہمت اٹھے تو اس فن کے مطالعہ سے مولانا مرحوم کی قائم کردہ بنیادوں پر بڑی عمارت تعمیر کر سکتا ہے -

تعلیم القرآن مولوی محمد عبدالرحیم صاحب - دارالاشاعت تعلیم القرآن، قطبی گوڑہ جدید، حیدرآباد دکن -

صاحب موصوف نے قرآن مجید کی تعلیم کو عام کرنے کے لیے تفسیر قرآن کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو بیس بیس صفحے کے رسالوں کی صورت میں مسلسل شائع ہو رہی ہے - اب تک پارۂ عم تقریباً ختم ہو چکا ہے - ہر سورہ کے آغاز میں سورہ کے مضامین کا خلاصہ اور اس کے متعلق ضروری معلومات دینے کے بعد تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ دو دو چار چار آیتیں نقل کر کے پہلے ان کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ دیا ہے، پھر آیات کا مربوط ترجمہ ہے، پھر لغات کی تشریح ہے اور آخر میں تفسیر ہے - تفسیر قابلِ اطمینان ہے، صحیح عقائد کے مطابق ہے، اور عامۃ الناس کو قرآن کے مطالب سے جس قدر آشنا ہونا چاہیے اُس کے لیے کافی ہے - ہر رسالہ کی قیمت ار اور محصول ڈاک دیائی ہے - ایک جلد کی قیمت (جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی) چار روپیہ مع محصول ڈاک رکھی گئی ہے -

تدوین حدیث مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی - ضخامت ۱۰۶ صفحات -

حدیث کے متعلق آج کل علم کی کمی اور اجتہاد کی جرأتِ بیجا کے سبب سے جو شبہات بکثرت پھیل گئے ہیں، اُنکی تردید میں بہت سے اہل علم حضرات نے مفید مضامین لکھے ہیں، مگر ہماری نظر میں مولانا مناظر احسن صاحب کے اس خطبہ سے زیادہ جامع، تشفی بخش اور فوائد سے لبریز کوئی چیز ابھی تک شائع نہیں ہوئی - یہ خطبہ حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے توسیعی خطبات کے سلسلہ میں پڑھا گیا تھا اور وہیں کے مجموعۂ تحقیقات علمیہ میں شائع ہوا ہے - جو لوگ حدیث کے بارے میں اپنے شکوک کو واقعی رفع کرنا چاہتے ہیں، یا حقیقت امر سے آگاہ ہونے کے خواہشمند ہیں اُنکو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے - افسوس ہے کہ کتاب پر نہ تو قیمت لکھی گئی ہے اور نہ یہی لکھا ہے کہ کوئی منگانا چاہے تو کہاں سے منگائے - بہتر ہو کہ مولانا

تاہم اردو خواں حضرات اس رسالہ سے بھی کسی حد تک اندازہ کر سکینگے کہ امام کس پایہ کے شخص تھے۔

خاکسار تحریک مذہب و سیاست کی روشنی میں | مولانا محمد منظور صاحب نعمانی ، ضخامت ۱۲۴ صفحات ۔ قیمت ۱ر ۔ مکتبۂ الفرقان ، بریلی ۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ، مصنف نے اس کتاب میں خاکسار تحریک پر دو حیثیتوں سے بحث کی ہے ، ایک یہ کہ جن نظریات اور اصولوں پر اس تحریک کی بنا رکھی گئی ہے وہ دین اسلام سے کہاں تک مطابقت رکھتے ہیں ، اور دوسرے یہ کہ سیاسی حیثیت سے یہ تحریک مسلمانوں کے لیے کہاں تک مفید ہے بحث کا تمام تر مدار خود اس تحریک کے مستند لٹریچر پر رکھا گیا ہے ، یا پھر ایسے واقعات پر جو ناقابل انکار ہیں ۔ طرز بحث نہایت سنجیدہ اور منصفانہ ہے ، اور اگر کوئی شخص واقعی امر حق معلوم کرنے کا خواہشمند ہو تو یہ کتاب اس کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے ۔

الفرقان ، شاہ ولی اللہ نمبر | مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب ۔ ضخامت ۴۳۲ صفحات ۔ قیمت قسم خاص مجلد سے ، غیر مجلد عہ ۔ قسم عام مجلد عہ ، غیر مجلد عا ۔ دفتر الفرقان بریلی ۔

الفرقان کو اس سے پہلے حضرت شاہ اسماعیل شہید اور حضرت شیخ احمد سرہندی رحمہما اللہ کے حالات میں دو مستقل نمبر شائع کرنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے ۔ اب اسی سلسلہ میں اس نے یہ تیسرا نمبر شائع کیا ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی سیرت سے تعلق رکھتا ہے ۔ یہ تیسرا نمبر خود الفرقان کے بھی پچھلے دونوں نمبروں سے بازی لے گیا ہے ، اور اس حیثیت سے بھی بے مثل ہے کہ شاہ صاحب اور ان کے دور اور ان کے کارناموں کے متعلق نہ تو اتنی معلومات اس سے پہلے کہیں جمع کی گئی تھیں ، اور نہ قلیل التعداد اہل علم کے ماسوا اس عظیم الشان شخصیت سے عامۂ خلائق کو کبھی اتنی تفصیل کے ساتھ روشناس ہونے کا موقع ملا تھا ۔ اس مجموعہ میں صرف شاہ صاحب کی سیرت ہی بیان نہیں ہوئی ہے ، بلکہ تاریخ ، عقائد ، اصول دین ، کلام ، فقہ اور مختلف موضوعات پر بھی بہت سی بیش قیمت معلومات ضمناً فراہم ہو گئی ہیں جو ناظرین کے لیے انشاء اللہ

از دیاد بصیرت کی موجب ہونگی۔

خلافت و سلطنت | تالیف ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ قیمت اور مقام اشاعت درج نہیں۔ موئف سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔

یہ اُس مقالہ کا اردو ترجمہ ہے جو مولف نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے لندن یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ اِس کا نام غلط فہمی میں ڈالنے والا ہے۔ آدمی اس نام کو پڑھ کر یہ گمان کرتا ہے کہ شاید اس میں خلافت اور سلطنت کے اصولی فرق و امتیاز کو نمایاں کیا گیا ہوگا۔ مگر دراصل یہ ایک تاریخی مضمون ہے جس میں مسلمانوں کی تاریخ کے اُس خاص دور سے بحث کی گئی ہے جبکہ عباسیوں کی نام نہاد خلافت سیاسی اقتدار سے محروم ہو کر رفتہ رفتہ ایک قسم کی مذہبی پاپائی میں تبدیل ہو گئی تھی اور اُسکے زیر اثر ممالک میں حکمرانی کے عملی اختیارات پر دوسرے متصرف ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اِس دور کی تاریخی و سیاسی تحلیل کر کے یہ دکھایا ہے کہ ایک ہی خطۂ ارضی میں "مذہبی خلافت" اور "سیاسی سلطنت" کے دو مختلف النوع ادارے کس طرح پیدا ہوئے، کس طرح اُنکا ارتقار ہوا اور تین چار سو برس تک اِن کے درمیان کس قسم کے تعلقات رہے۔

موضوع بلاشبہ دلچسپ ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے بہت اچھا تاریخی مواد فراہم کیا ہے، لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ اِس مواد پر بحث کا جو انداز اُنہوں نے اختیار کیا ہے وہ اہلِ یورپ کے تاریخی ذوق سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اسلام اور اسلامی تاریخ کے نقطۂ نظر سے اُنکی بحث نہ صرف ناقص ہے بلکہ مسائل کو صاف کرنے کے بجائے اور زیادہ الجھا دیتی ہے۔ اگر وہ مغربی مذاق کے بجائے اسلامی مذاق کی رعایت کرتے تو پہلے خلافت کے معنی و مفہوم کو متعین کرتے، پھر واضح طور پر یہ بتاتے کہ عباسیوں نے پاپائی اور قیصریت کے جس مجموعہ پر لفظ "خلافت" کا اطلاق کیا تھا وہ حقیقی اسلامی خلافت سے کس قدر مختلف تھا اور اِن دونوں حقیقتوں کی وضاحت کرنے کے بعد اپنا تاریخی بیان پیش کرتے اس تنقیح

کے بغیر ڈاکٹر صاحب نے جس طرح واقعات کو بیان کیا ہے اُس سے یہ غلط فہمی واقع ہوتی ہے کہ واقعی وہ مذہبی خلافت تھی جس سے آخر کار سلطنت جدا ہوئی۔ حالانکہ دراصل جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ ابتدائی شاہان عباسیہ کی بنائی ہوئی معجون مرکب تحلیل ہوگئی، اسکے ایک جزء یعنی پاپائی کو بعد کے عباسی سنبھال کر بیٹھ گئے اور دوسرے جزء یعنی قیصریت کو دوسروں نے بانٹ لیا، اور پھر یہ دونوں گروہ مذہبی اصطلاحوں اور مذہبی لباسوں کو محض سیاسی چال کے طور پر استعمال کر کرکے صدیوں تک عوام کو دھوکا دیتے رہے۔

فتنۂ رہبانیت | تالیف جناب مرزا عزیز صاحب فیضانی۔ ضخامت ۲۴۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ مرزا محبوب عالم صاحب۔ فیضانی منزل۔ اسلامیہ پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

اس کتاب میں مصنف نے پہلے دنیا پرستی اور ترکِ دنیا کے درمیان اسلام کی راہِ توسط واعتدال کو بیان کیا ہے، پھر رہبانیت کی حقیقت بیان کرنے کے بعد نہایت تفصیلی تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ یہ کن کن شکلوں میں ظہور کرتی ہے، اور کس کس طرح انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اثر ڈالتی ہے۔ آخر میں دنیا کو برتنے کے متعلق اسلام کے احکام کی تفصیلات دی ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا طریقہ رہبانیت کے طریقہ سے کس قدر مختلف ہے۔ کتاب نہایت جامع ہے، خصوصاً رہبانیت کی مخفی سے مخفی صورتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنے اور اسلام و رہبانیت کے بیشمار مرکبات کا تجزیہ کرکے اصل فتنہ کا سراغ لگانے میں مصنف نے دقیقہ رسی کا حق ادا کر دیا ہے۔

ہندوستان کی کہانی | تالیف مولوی عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی۔ ضخامت ۶۷ صفحات۔ قیمت ۱۲؍ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

اب تک ہندوستان کی تاریخ جس رنگ میں ہندوستانی بچوں کو پڑھائی جاتی رہی ہے اُس نے یہاں کے باشندوں کو ایک دوسرے کے لیے درندہ بنا دیا ہے اور انکے درمیان مستقل قومی عداوتوں کے بیج بو دیے ہیں۔ اصلاح حال کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے سامنے اس ملک کی تاریخ ہر قسم کے

زہر سے پاک کرکے مجرد تاریخ کی حیثیت سے پیش کی جائے۔ دار المصنفین اور مولوی عبدالسلام صاحب دونوں ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہمارے بچوں کے لیے ایسی ایک بے زہر تاریخ مہیا کر دی ہے کم از کم غیر سرکاری مدرسوں کے لیے تو یہ موقع ہے کہ اس کتاب کو اپنے نصاب میں شامل کرلیں۔

ابن خلدون | مولانا عبدالسلام ندوی۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت عہ۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

یہ کتاب دراصل ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری کے اس مقالہ کا ترجمہ ہے جو انہوں نے فرانس کی سربون یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کیا تھا۔ اصل مقالہ فرنچ میں تھا۔ پھر اس سے عربی میں ترجمہ ہوا اور اب عربی سے اردو میں منتقل ہوا ہے۔ ابتدا میں مصنف نے ابن خلدون کے ذاتی حالات زیادہ تر اسکی اپنی خود نوشت سوانح عمری سے اخذ کرکے مرتب کیے ہیں، پھر تاریخ و اجتماعیات کے متعلق اسکے فلسفہ کی تشریح توضیح اور تنقید کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان علوم میں اس مشہور مفکر کا اصلی مقام کیا ہے۔ کتاب اہل ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے، اور فاضل مترجم نے ترجمہ بھی اس قدر رواں اور شگفتہ کیا ہے کہ کتاب پڑھتے وقت کم ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے۔

مفتاح القراۃ | مرتبہ مولانا عبداللہ رشید مکی صاحب خطیب سورتی جامع مسجد رنگون۔

بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کا جو طریقہ ہندوستان میں رائج ہے اس میں من جملہ بہت سی خرابیوں کے ایک خرابی یہ بھی ہے کہ تجوید کے قواعد کا مطلق لحاظ نہیں رکھا جاتا اور ابتدا سے بچوں کو غلط تلفظ اور غلط لہجہ میں قرآن پڑھنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ مولانا عبداللہ رشید صاحب نے اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے یہ قاعدہ مرتب کیا ہے۔ چونکہ فاضل مرتب محض ایک ماہر فن قاری ہی نہیں ہیں بلکہ انہیں تعلیم کا بھی بہت طویل تجربہ ہے اسلیے قاعدہ کی ترتیب ایسی اچھی ہے کہ اب تک اس سے بہتر قاعدہ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ ابتدا میں استادوں کی ہدایت کے لیے طریق تعلیم کی کافی توضیح کر دی گئی ہے، اور قاعدہ کے دوران میں بھی اکثر اسباق کی مشق کرانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ دراصل یہ قاعدہ بچوں کے لیے نہیں بلکہ استادوں کے لیے لکھا گیا ہے۔

تذکرۂ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

(یعنی قیمتی اضافات اور نہایت مفید ترمیمات کے ساتھ)

مشہور دینی ماہنامہ "الفرقان" بریلی کے

"شاہ ولی اللہ نمبر" کا

دوسرا کتابی ایڈیشن

جس کی تیاری میں

ادارہ "الفرقان" کے علاوہ ملک کے منتخب علمائے کرام اور ممتاز اہل قلم و ارباب تحقیق نے بھی خاص حصہ لیا ہے

جنکے اسمارِ گرامی صفحات مابعد کی فہرست مضامین سے معلوم ہوسکتے ہیں

افادیت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے

کہ اسکا پہلا ایڈیشن فروری سلسلہ ۱۹۴۱ء میں شایع ہوا تھا جو صرف پندرہ دن میں ختم ہوگیا، اب شائقین کے بیحد اصرار پر یہ دوسرا کتابی ایڈیشن تیار کرایا گیا ہے جو ہر حیثیت پہلے ایڈیشن سے زیادہ مکمل اور بہت فائق ہے ۔ مگر کاغذ وغیرہ کی گرانی کی وجہ سے اس مرتبہ بہت تھوڑی تعداد میں تیار کرایا گیا ہے اور توقع ہے کہ یہ بھی بہت جلد ہی ختم ہو جائیگا۔ لہٰذا شائقین فرمائش بھیجنے میں تاخیر نہ فرمائیں

اسمیں کیا کیا ہے؟ اگرچہ بظاہر اس کا تعلق صرف حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ہے لیکن فی الحقیقت یہ

تاریخی معلومات، سیاسی نکات، مذہبی معارف اور دینی ہدایات کا بحر ذخار ہے

مختلف قسم کے مذہبی و سیاسی اور علمی و تاریخی مباحث کے متعلق اس دوسرے ایڈیشن میں تقریباً ساڑھے تین سو عنوانات ہیں جنکے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ کے ارشادات اور طریق عمل کی روشنی میں اسمیں بحث کی گئی ہے ۔ ان عنوانوں میں سے تقریباً ڈیڑھ سو عنوان ناظرین کے ملاحظہ کیلیے یہاں بھی درج کیے جارہے ہیں۔ تاکہ اسکی اہمیت اور جامعیت کا کچھ اندازہ آپ کرسکیں

نظمیں اور فوٹو بلاک: حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق بلند پایہ شعراء کی وجد آفریں نظمیں اور آپکے دست خاص کی لکھی ہوئی دو تاریخی تحریروں کے فوٹو، نیز آپکے مزار مبارک اور حضرت شاہ عبدالرحیمؒ و شاہ عبدالعزیزؒ کے مزارات کے فوٹو، اور اکبرآبادی مسجد کا فوٹو جو حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ کی آخری اقامت گاہ تھی لیکن آج اس کا نشان بھی موجود نہیں) اس مجموعہ میں آپ ملاحظہ فرمائینگے، یہ سب فوٹو آرٹ پیپر پر ہیں۔ ٹائٹل سہ رنگا نہایت حسین اور باصرہ نواز ہے جو بلاکوں سے نہایت اعلیٰ قسم کے آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے کہ جس کی بہتر اس وقت ہندوستان میں دستیاب نہیں ہوسکتا۔ قیمت وغیرہ کی تفصیلات آخری صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے۔ ناظم الفرقان بریلی۔ یو۔ پی

تذکرہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے

ساڑھے تین سو عنوانوں میں سے صرف ڈیڑھ سو عنوان یہ ہیں

حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مدظلہ کی تاثرات
ارشاد گرامی۔ انحضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ
ہندوستان میں قرآن فہمی کا چرچا اور شاہ ولی اللہؒ
(از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر صدق)
شاہ صاحب سے پہلے ہندوستان میں اسلام کی سرگزشت
(از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی)
(اس مقالہ کے چند ضمنی عنوانات یہ ہیں)
عرب اور مغل فاتحین اور ان کا مذہبی فرق
دسویں صدی ہجری سے پہلے اسلام کی عام حالت
اس دور کے بعض مصلحین اور خدام دین
محمد تغلق اور خدمت دین
فیروز تغلق کی مساعی اصلاح
سکندر لودھی کی اصلاحات
دور ضلالت یا عہد اکبری
حضرت مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ
شیخ عبدالحق کی دینی خدمات
عالمگیر اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کی جد وجہد
امام ولی اللہ دہلویؒ کا ظہور

منصب تجدید کی حقیقت اور
تاریخ تجدید میں شاہ ولی اللہؒ کا مقام
(از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)
[اس مقالہ کے چند ضمنی عنوانات یہ ہیں]
اسلام اور جاہلیت کی اصولی و تاریخی کشمکش،
جاہلیت کی اقسام اور جاہلی نظریات
اسلام کا نظریہ تمدن،
نبی کے کام کی نوعیت
جاہلیت کا حملہ
کار تجدید کی نوعیت اور اس کے چند شعبے
مجددین کے کارنامے
حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تجدید دین
ائمہ اربعہ کا تجدیدی کارنامہ
امام غزالی کی مجددانہ مساعی
امام ابن تیمیہ کا جہاد تجدید
امام ربانی مجدد الف ثانی کا تجدیدی کام
حضرت شاہ ولی اللہؒ کا کام اور پیغام
حضرت سید احمد اور شاہ اسمٰعیل شہید
تحریک جہاد کی ناکامی کے اسباب
عہد حاضر میں کار تجدید کی ضرورتیں

اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں خدا کا
ایک وفادار بندہ
(از مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ)
(یہ مقالہ ۲۰۳ صفحات پر ہے اور اس میں سو سو سے زیادہ ضمنی عنوانات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔)
الف ثانی کے تجدیدی کارنامہ کی انتہا
عہد عالمگیری کے بعد فتنوں کا زور
شاہ عبدالعزیز کے خونی آنسو
دلی کے خونی فتنے اور شاہ ولی اللہ کی استقامت
سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک
مسلمانوں پر لرزہ خیز مظالم
نظریہ تقسیم ہند یا پاکستانی اسکیم
انسانوں کے ہیولے
مرہٹہ تحریک کا نصب العین
دلی کے لال قلعہ پر مرہٹوں کا قبضہ
حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ایک تاریخی خواب،
خواب کی تعبیر اور پانی پت کی تاریخی جنگ،
غازی ابدالی کا حملہ اور مرہٹہ طاقت کی شکست،
پھر مسلمانوں کی غفلت اور شاہ صاحب کی طرف سے
خطرہ کا مسلسل الارم
مسلمانوں کے مختلف طبقات کو شاہ صاحب کا
پیغام اور مفصل پروگرام
سلاطین اسلام سے شاہ صاحب کا خطاب
امراء اور ارکان دولت سے خطاب
فوجی سپاہیوں سے خطاب
اہل صنعت و حرفت سے خطاب
پیروں اور پیرزادوں سے خطاب
غلط کار علماء سے خطاب
واعظوں اور زاہدوں سے خطاب
عام امت مسلمہ سے جامع خطاب
ہندی مسلمانوں کا جمود یا مرنے کا تہیہ!
خواب غفلت کی سزا، انگریزوں کا تسلط
کارتوسی بندوقوں کے ساتھ لارڈ کلائیو کا پہلا حملہ
میر جعفر وغیرہ کی غداری
سراج الدولہ کا لرزہ خیز قتل
مرشدآباد کے بازاروں میں سراج الدولہ کی لاش
بنگال بہار و اڑیسہ کی دیوانی کمپنی بہادر کے نام

"قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

منجملہ ساڑھے تین سو عنوانوں کے جو ڈیڑھ سو عنوان یہاں درج ہوئے ہیں انہی سے آپ نے اس کی جامعیت اور افادیت کا اندازہ فرما لیا ہوگا

اس کے مطالعہ سے جو خاص چیزیں آپ کے علم میں آئینگی انکی ایک مختصر فہرست بطور خلاصہ یہ ہے۔

(۱) تجدید دین کی حقیقت، مقام مجددیت کی تشریح اور مجدد دین کے فرائض ۔ تاریخ اسلام کے مشہور مجددین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، امام غزالیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حضرت مجدد الف ثانی حضرت شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے تجدیدی کارناموں پر تبصرہ اور دور حاضر میں تجدید دین و احیاء ملت کا نقشہ اور اس کی مزید ضرورتیں۔

(۲) ہندوستان میں اسلام کے داخلہ سے لیکر عہد عالمگیری تک کی پوری دینی تاریخ کہ کس زمانہ میں عرب کے اس مسافر پر یہاں کیا گزری اور کن سلاطین نے خدمت دین کا حق ادا کیا۔

(۳) غازی اورنگ زیبؒ سے لیکر سلطنت مغلیہ کے سقوط، انگریزوں کے تسلط اور پھر شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک جہاد تک کے حالات پر مفصل تبصرہ یعنی سکھ تحریک، مرہٹہ گردی، نادر شاہ درانی کی خونریزی اور غازی احمد شاہ ابدالی کی جنگ کے اسباب و اثرات اور ان تمام سیاسی واقعات سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے تعلقات اور تاثرات اور ان انقلابات کے متعلق آپ کے الہامات۔

(۴) حضرت شاہ ولی اللہ کی سوانح حیات ان کے آباؤ اجداد، اساتذہ و مشائخ، خاص تلامذہ اور اولاد امجاد کے حالات اور علمی و دینی خدمات۔

(۵) شاہ صاحب کی علمی و عرفانی خصوصیات قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف سے متعلق علوم میں آپ کی تجدید اور فلسفہ تشریع کی تاسیس و تدوین۔

(۶) دور حاضر کے مسلمانوں کے لیئے لائحہ عمل اور صحیح اسلامی انقلاب کا ولی اللہی پروگرام

ضخامت و قیمت:۔ ۲۴۳ صفحات اسائز یہی جو آپ کے پیش نظر ہے کتابت طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید چکنا قسم عام ۶۰ پونڈ والا قیمت دو روپیہ (عہ) قسم خاص ۴۲ پونڈ والا کاغذ نہایت اعلےٰ ڈھائی روپیہ (عہ) محصولڈاک قسم عام ۸ قسم خاص ۹ جلد کی قیمت ۸ زیادہ ہوگی جلد نہایت خوشنما ہے جس پر بلاک سے سنہری حروف میں نام کندہ ہے۔ ملنے کا پتہ مکتبہ الفرقان بریلی

رسالۂ دینیات

رسالۂ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں و لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۲ محصولڈاک ۲ خرچ وی پی ۳

TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM

BY

SAYYID ABUL-ALA MAUDUDI

This small book is an attempt at a clear and concise interpretation of Islam. [Th]e chief aim in veiw has been to present within a brief space the most systema[tic] and logical conception of Islam to build a coherent and organic structure of [hu]man life on the basis of this conception and to give a comprehensive and [lu]cid account of what this religion in reality is.

Price 1-8-0

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

سرورق پیکن پریس نیل روڈ لاہور میں طبع ہوا

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنےوالی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحّص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہٗ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

Registered No. L. 4186

ربیع الاول ۱۳۶۰ھ — جلد ۱۸ – عدد ۳

ترجمان القرآن ۴۸۶

ماہنامہ Nasim

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک ۔ پونچھ روڈ ۔ لاہور

چندہ فی پرچہ

چندہ سالانہ [redacted]

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید' ہدایت و ضلالت' عبادت' جہاد' آزادی' رواداری' قومیت اسلامی' عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا' رسول کی صحیح حیثیت' رسالت محمدی کا ثبوت عقلی' شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق' منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول غیرمجلد ایک روپیہ آٹھ آنے قیمت مجلد دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنہیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مُسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مُسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد -/۴/۱ مجلد -/۸/۱ محصولڈاک -/۴/-

فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول سنہ ۶۰ھ (مطابق مئی ۱۹۴۱ء) جلد ۱۸۔ عدد ۳

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس سرکلر روڈ میں طبع ہو کر
دفتر ترجمان القرآن پونچھ روڈ، مبارک پارک لاہور سے شائع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

محرم کی اشاعت میں جماعت اسلامی کی تشکیل کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا اس کو دیکھ کر بہت سے اللہ کے بندوں نے ایسی ایک جماعت میں شامل ہونے کا ارادہ ظاہر کر دیا تھا، بلکہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے مقامی جماعتیں بننے کی اطلاعیں بھی آنی شروع ہو گئی تھیں۔ پھر صفر کی اشاعت میں درخواست کی گئی کہ جو لوگ اس نقشہ پر کام کرنا پسند کرتے ہیں وہ براہ کرم ہم کو اطلاع دیں تاکہ ان کے درمیان ربط پیدا کرنے کی کوئی صورت نکالی جا سکے۔ اس کے جواب میں بہت سے وہ لوگ بھی گویا ہوئے جو دل میں ارادہ رکھتے تھے مگر اب تک خاموش تھے۔ اس طرح وسط ماہ اگست تک تقریباً ڈیڑھ سو اصحاب کی فہرست تیار ہو گئی پھر یہ مناسب سمجھا گیا کہ ۲۵ اگست کو لاہور میں ان اصحاب کا ایک اجتماع عام منعقد کیا جائے۔ چنانچہ اجتماع کی دعوت دے دی گئی۔ تاریخ مقررہ پر ۷۵ اصحاب تشریف لائے جن میں سے بعض اپنی مقامی جماعتوں کے نمائندہ مختار تھے، اور بعض انفرادی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ چار روز تک مشاورت جاری رہی۔ جماعتی تشکیل کا جو ابتدائی خاکہ محرم کے پرچہ میں شائع کیا گیا تھا اس پر غور کیا گیا اور باہمی مشورہ سے بالاتفاق ایک دستور جماعت مرتب ہوا جو اس اشاعت میں درج کیا جا رہا ہے۔ پھر تمام اصحاب نے دستور کے مطابق پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ کلمہ شہادت ادا کیا اور جماعتی نظم کے ساتھ اسلامی نصب العین کے لئے جدوجہد کرنے کا عہد کیا۔ پھر آئندہ کام کے متعلق ایک پروگرام بھی طے ہو گیا جس پر توکلاً علی اللہ کام شروع کر دیا گیا ہے۔ یہ سب مراحل خدا کے فضل سے بخوبی طے ہو گئے۔ اب آئندہ مراحل کی کامیابی رفقاء کے خلوص نیت اور اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔

دستورِ جماعت کے بارے میں چند کلمات بطورِ تشریح عرض کرنے ضروری ہیں۔ اگرچہ دستور کو پڑھ کر ہر شخص خود ہی اس جماعت کی نوعیت اور اس کی ترکیب اور اس کے مقصد کے متعلق بآسانی رائے قائم کر سکتا ہے تاہم بعض امور ایسے ہیں جن کی توضیح دستور میں نہ کی جا سکتی تھی، لہٰذا یہاں ان کو بیان کر دیا جاتا ہے۔

اس دستور کی بنیاد جس خیال پر رکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اسلام کے کسی ایک جزء کو، یا مسلمانوں کے دنیوی مقاصد میں سے کسی مقصد کو لے کر نہ اٹھیں بلکہ اصل اسلام اور پورے اسلام کو لے کر اٹھیں جس مقصد کے لئے انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے وہی ہمارا مقصد ہو۔ جس چیز کی طرف انہوں نے دعوت دی اُسی کی طرف ہم دعوت دیں جس طرز پر وہ ایمان لانے والوں کی جماعت بناتے تھے اسی طرز پر ہم جماعت بنائیں، جو نظامِ جماعت اُن کا تھا وہی ہمارا ہو جن ضوابط کو وہ اپنی جماعت میں نافذ کرتے تھے انہی کو ہم بلا کسی کمی و بیشی کے نافذ کریں، اور جس طریقہ سے وہ اپنے نصب العین کے لئے جدوجہد کرتے تھے اسی طریقہ سے ہم جدوجہد کریں غرض یہ کہ ہماری یہ تحریک ذرہ برابر نہ اسلام سے کم کسی چیز پر مشتمل ہو اور نہ اُس سے زائد، بلکہ پورے کے پورے اسلام ہی کو ہم اپنی تحریک بنا لیں۔ اسی لئے ہم اُس جماعت کو جو اس دستور پر بنی ہے "جماعتِ اسلامی" کہتے ہیں کیونکہ اس کا عقیدہ، نصب العین، نظامِ جماعت، اور طریقِ کار بعینہٖ وہی ہے جو اسلامی جماعت کا رہا ہے۔

قریبی دور میں مسلمانوں میں جو تحریکیں اٹھی ہیں ان میں چار اصولی خرابیاں تھیں۔ ایک یہ کہ اُن میں نفسِ اسلام کو بنائے حرکت نہیں ٹھہرایا گیا تھا بلکہ ان کے اندر بنائے حرکت یا تو اسلام کا کوئی ایک جزء تھا جس سے محرکین کو خاص دلچسپی تھی، یا مسلمانوں کا کوئی دنیوی مقصد تھا جسے براہ راست اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کا نظامِ جماعت بے کم و کاست اسلامی طرز کا نہ تھا بلکہ مختلف غیر مسلم جماعتوں کے نظامِ ترکیبی کی نقل کی گئی تھی۔ تیسرے یہ کہ ان میں تمام عرفی مسلمانوں کو حقیقی معنی میں مسلمان سمجھ کر ہر قسم کے رطب و یابس آدمی بھر لیے گئے جن کی سیرتوں پر ہرگز وہ اعتماد نہ کیا جا سکتا تھا جس کا ایک حقیقی مسلمان مستحق

ہوتا ہے، اور یہی چیز آخر کار ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بنی، کیونکہ عام ارکان سے لے کر کارکنوں اور لیڈروں تک کم ہی آدمی ایسے تھے جو اعتماد کے لائق ہوں۔ چوتھے یہ کہ ان کی دعوت عام نہ تھی، صرف پیدائشی مسلمانوں تک محدود تھی، اور غیر مسلموں کے لیے صرف یہی نہیں کہ اُن میں کوئی کشش نہ تھی بلکہ بالفعل اُن میں سے اکثر میں غیر مسلموں کو اسلام سے اور زیادہ دور بھگا دینے کا سامان موجود تھا۔

ہم نے ان چاروں خرابیوں سے بچنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ یہاں عین اسلام ہی کو بنائے حرکت بنایا گیا ہے۔ نظام جماعت بے کم و کاست وہی کا وہی لیا گیا ہے جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ جماعت کا تھا۔ جماعتی ضوابط ایسے رکھے گئے ہیں کہ مسلمانوں کی قوم میں سے صرف وہ صالح عنصر چھٹ کر جماعت میں آئے جو حقیقت میں ایمان و عمل صالح کی دولت رکھتا ہو۔ اور جماعت کی دعوت محض پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہیں رکھی گئی ہے بلکہ تمام روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کے لیے عام ہے، آدم کا جو بیٹا اور جو بیٹی توحید اللہ کا اعتقاد، محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع، حکومت الٰہیہ کا نصب العین اور ضابطۂ شریعت کی پابندی قبول کرے اس کے لیے جماعت اسلامی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

"جماعتِ اسلامی" کے نام سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس جماعت سے باہر جو لوگ ہیں ان کو ہم غیر مسلم سمجھتے ہیں۔ ہم نے یہ نام جس وجہ سے اختیار کیا ہے وہ اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس جماعت کے مسلک میں نہ اسلام سے کم کوئی چیز ہو نہ اُس سے زائد، جس کا عقیدہ وہی ہو جو اسلام کا ہے، نصب العین وہی ہو جو اسلام نے پیش کیا ہے، نظام جماعت وہی ہو جس کا نقشہ کتاب و سنت میں ملتا ہے، اور کام کا ڈھنگ وہی ہو جو انبیاء نے سکھایا ہے، اس کے لیے آخر جماعت اسلامی کے سوا اور کیا نام ہو سکتا ہے۔ مگر ہم ہرگز یہ فرض نہیں کرتے اور ایسا فرض کرنے کا ہم کو حق نہیں ہے کہ ایمان بس اسی جماعت کے اندر منحصر ہے اور اس کے باہر جو لوگ ہیں وہ مومن نہیں ہیں۔ بلکہ اگر کوئی اس جماعت کی مخالفت کرے تب بھی مجرد اس کی مخالفت کی بنا پر ہم اس کو غیر مومن نہیں کہہ سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں ایمان اُس جماعت کے اندر ہی منحصر ہوتا تھا جو انبیاء کی قیادت میں بنتی تھی، اور یہ بھی صحیح ہے کہ انبیاء کے بعد اُن کے خلفاء کے عہد میں جب تک اصل جماعت کا نظام

برقرار رہا، اُس سے علیحدہ رہنے کے معنی اسلام سے علیحدگی ہی کے تھے جیسا کہ صریح طور پر نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔ لیکن بہت بڑا فرق ہے اُس جماعت میں جو ابتداءً کسی نبی کے زیر قیادت بنی ہو اور اُس جماعت میں جو ابتدائی نظام جماعت کے درہم برہم ہوجانے کے بعد دوبارہ اس کی تجدید کے لئے کوشش کرے۔ پہلی جماعت دنیا میں صرف ایک ہی ہوگی اور اس کے باہر کفر ہوگا، اگر دوسری قسم کی جماعتیں دنیا میں بہت سی ہوسکتی ہیں اور اُن میں سے کسی جماعت میں شامل نہ ہونے کے اسباب کفر و نفاق کے سوا اور بھی ہونے ممکن ہیں۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص ہم سے زیادہ صاحب ایمان ہو اور وہ نیک نیتی کے ساتھ کسی غلط فہمی کی بنا پر ہماری مخالفت کرے۔ اپنی حد تک ہم انتہائی کوشش کریں گے کہ اپنے مسلک اور طریق کار کو عین اسلام کے مطابق رکھیں تاکہ کسی شخص صالح و مومن کے لئے ہم سے علیحدہ رہنے کی کوئی وجہ نہ ہو اور اس طرح تمام اہل ایمان آخر کار ایک ہی نظام میں منسلک ہوسکیں۔ لیکن اپنی اس آرزو کو ایک حاصل شدہ واقعہ فرض کرکے ہم ہرگز فتنہ میں نہ پڑیں گے۔ ہم کو بہرحال مسلمانوں میں ایک فرقہ بننے سے بچنا ہے اور اُس غلو سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں جو ہمیں خیر کے بجائے شر کا خادم بنا دے۔

ہمارے نصب العین میں محض لفظ "حکومت" کو دیکھ کر بعض لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے سیاسی اقتدار کو اپنا مقصود بنایا ہے اور اسلام کو بالکل ایک سیاسی چیز بنا کر رکھ دیا ہے۔ حالانکہ دراصل زمین و آسمان کا فرق ہے مجرد حکومت میں اور اُس حکومت الٰہیہ میں جس کو ہم اپنا نصب العین کہتے ہیں۔ "حکومت الٰہیہ" کے قیام سے ہماری مراد بعینہ وہی ہے جو لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ سے قرآن کی مراد ہے، اور یہ ہمارا خود ساختہ نصب العین نہیں ہے بلکہ اللہ نے اُسی کو اپنے نبی کی بعثت کا مقصد قرار دیا ہے۔ اگر اس چیز کو اپنی سعی و جہد کا مقصود بنانے پر کوئی ہمیں الزام دینا چاہتا ہے تو وہ خود ہی سوچ لے کہ وہ کس کو الزام دے رہا ہے۔

قرآن کے مطالعہ سے ہم نے جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا پورا نظام "اسلام" یعنی اللہ تعالیٰ

کی اطاعت پر قائم ہے۔ اس نظام کے اندر انسان جس کو طاعت و عصیان کا اختیار دیا گیا ہے، اگر اپنے دائرۂ اختیار کی حد تک اللہ کی اطاعت سے آزاد ہو جائے اور اپنے نفس کا حکم یا کسی اور کا حکم ماننے لگے تو یہ نہ صرف حق کے خلاف ہے، نہ صرف فطرت کائنات اور فطرت انسانی کے خلاف ہے، بلکہ اس کا لازمی نتیجہ فتنہ و فساد ہے، کیونکہ اللہ کے سوا کائنات کے کسی جزء میں کسی حیثیت سے بھی کسی دوسرے کا حکم چلنا نظام کائنات کی اُس ہم آہنگی کی ضد واقع ہو جاتا ہے جو اقتدار اعلیٰ کی وحدت پر قائم کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس فتنہ کو مٹانا چاہتا ہے اور اس کا منشا یہ ہے کہ انسان جس طرح غیر شعوری طور پر مسلم ہے اُسی طرح شعوری طور پر بھی اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرکے اور اس کے امر تشریعی کی ماتحتی قبول کرکے مسلم ہو جائے۔ اسی چیز کا نام "الاسلام" اور "الدین" ہے جیسا کہ فرمایا اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ لیکن اللہ اس کام کو اپنی قدرت قاہرہ کے زور سے جبراً نہیں کرتا، بلکہ انبیاء کے ذریعہ سے انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ تم الدین اور الاسلام کو اختیار کرو۔ پھر انسانوں میں سے جو لوگ اسے اختیار کرلیں اُن کو وہ اپنی پارٹی بناتا ہے اور اس بات پر مامور کرتا ہے کہ پہلے تو تم فتنے کو مٹاؤ، یعنی میری زمین میں میرے سوا جس جس کا حکم چل رہا ہے اس کی حکمرانی کا خاتمہ کردو، پھر اس بات کی کوشش کرو کہ سب انسان الدین اور الاسلام کو اختیار کرلیں۔ وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ، اور ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ۔ پس دراصل غیر الٰہی اقتدار کے فتنے کو مٹانا اور انسانی زندگی کے اختیاری حصہ میں اللہ کی حکومت قائم کرنا تو عین مقصد بعثت انبیاء رہا ہے اور اللہ کے حکم سے انبیاء کرام نے جہاں بھی جماعت اسلامی بنائی ہے اس کا مقصد وحید یہی رہا ہے۔ اس مقصد کو سن کر اگر لوگ چونکتے ہیں تو بجز اس کے کہ ہم قرآن کے علم سے ایسے لوگوں کی محرومی پر ماتم کریں اور کیا کرسکتے ہیں۔

رہا بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اس نصب العین میں روحانیت کے بجائے مادیت ہے، تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جو لوگ ایسا خیال رکھتے ہیں وہ دراصل روحانیت کے اسلامی تصور کے بجائے کسی جاہلی تصور میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اسلام میں روحانیت کا کوئی تصور قرب خداوندی کے سوا نہیں ہے۔ اور خدا سے قرب کی اس سے بڑھ کر کوئی صورت متصور نہیں ہو سکتی کہ ایک مشن میں انسان اور خدا دونوں ایک دوسرے کے رفیق کار اور ساتھی ہوں۔ نمازیں، روزے میں اور تمام عبادات و معاملات میں تو بندہ عبد ہے اور خدا معبود، مگر قیام حکومت الٰہیہ کی جدوجہد میں عبد کو یہ شرف نصیب ہوتا ہے کہ وہ معبود کا رفیق بن جاتا ہے۔ معبود اس کا مددگار ہوتا ہے، اور وہ معبود کا مددگار۔ کیا بندے کے لئے اس سے بڑھ کر بھی روحانی ترقی و عروج کے کسی مرتبے کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افضل الناس مومن مجاھد بنفسہ و مالہ فی سبیل اللہ۔ پس ہمارے نزدیک تو یہ بات علم دین کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ جو چیز کمال روحانیت بلکہ بلند ترین مرتبۂ روحانیت کی طرف لے جانے والی ہے اُس میں کسی کو مادیت کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔

طبقات کی جو تقسیم دستور میں کی گئی ہے وہ بظاہر ایک اجنبی چیز معلوم ہو گی اور شاید اعتراض کیا جائے کہ یہ چیز تم نے خود ایجاد کی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ دور نبوت میں اس چیز کا نشان ملتا ہے، اور خود قرآن میں اس کی طرف صریح اشارات موجود ہیں۔ مثلاً ایک وہ گروہ ہے جس کے متعلق فرمایا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (اہل ایمان میں سے کچھ وہ ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو سچا کر دکھایا)۔ یہ لوگ ہر قربانی کے لئے مستعد تھے، ہر پکار پر لبیک کہتے تھے، اور جس حق پر ایمان لائے تھے اس کی خاطر کوئی چوٹ کھانے اور کوئی مشقت برداشت کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس کے متعلق فرمایا لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ

وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ...... وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَا اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ۔

یہ وہ لوگ تھے جو دل سے تو سچے خیر خواہ تھے اور دل میں تمنا بھی رکھتے تھے کہ راہ خدا میں جانفشانی دکھائیں، مگر اپنے حالات سے واقعی مجبور تھے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے: لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ وہ لوگ تھے جو ایمان رکھتے تھے، ایمان کے کم سے کم مقتضیات کو پورا بھی کرتے تھے، مگر محض ضعف ایمانی کی وجہ سے راہ خدا میں کوئی بڑی چوٹ سہنے اور کسی بڑے نقصان کو برداشت کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

یہاں تمام آیات کا استقصا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ بتانا ہے کہ طبقات کی یہ تقسیم کتاب و سنت ہی کے اشارات سے ماخوذ ہے اور اس کو موجودہ حالات پر کافی غور و خوض کے ساتھ منطبق کیا گیا ہے۔ ان مختلف طبقوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ اس طرح ہر طبقہ اپنے حدود کو پہچان کر اپنے دائرۂ عمل میں کام کرے گا، اور ایک طبقہ کی کمزوریاں دوسرے طبقہ کے لئے سنگ راہ نہ بن سکیں گی۔ ان کو خلط ملط کر دینے میں یہ اندیشہ ہے کہ ضعفا اپنی مصلحتوں کی خاطر نہ خود کوئی بڑا کام کر سکیں گے اور نہ دوسروں کو کرنے دیں گے۔

دستور جماعت اسلامی

عقیدہ

۱- جماعت اسلامی کا بنیادی عقیدہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے یعنی صرف اللہ ہی ایک الٰہ ہے، اسکے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

تشریح:۔ اس عقیدہ کے پہلے جزء یعنی اللہ کے الٰہ واحد ہونے اور کسی دوسرے کے الٰہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان اور جو کچھ آسمان و زمین میں ہے، سب کا خالق، پروردگار، مالک، مدبّر اور حاکم صرف اللہ ہے، ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی و کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریاد رس اور حامی و ناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہی نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقویٰ اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے امیدیں وابستہ نہ کرے، کیونکہ تمام اختیارات کا مالک وہی اکیلا ہے۔ اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو مدد کے لیے نہ پکارے، کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زور آور بھی نہ سمجھے کہ اسکی سفارش سے قضائے الٰہی ٹل سکتی ہو کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں خواہ وہ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے، کسی کی نیازمندی نہ اختیار کرے، کیونکہ تنہا وہی عبادت کا مستحق ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک، مقتدر اعلیٰ نہ تسلیم کرے، کسی کو باختیار خود حکم دینے

اور منع کرنیکا مجاز نہ سمجھے، کسی کو شارع اور قانون ساز نہ مانے، اور اُن تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کردے جو ایک اللہ کی اطاعت کے ماتحت اور اس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے، اسکے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا۔

نیز اس عقیدہ کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان اپنی آزادی وخود مختاری سے دست بردار ہو جائے، اپنی خواہش نفس کی بندگی چھوڑ دے، اور اللہ کا بندہ بنکر رہے جسکو اس نے الٰہ تسلیم کیا ہے۔ اپنے آپکو کسی چیز کا مالک مختار نہ سمجھے، بلکہ ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان، اپنے اعضاء، اور اپنی ذہنی وجسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی ملک اور اسکی طرف سے امانت سمجھے۔ اپنے آپکو اللہ کے سامنے ذمہ دار وجواب دہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اسے اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند کو اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔ اللہ کی رضا اور اسکے قُرب کو اپنی تمام سعی وجہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھیرائے۔ اپنے لیے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت، اور صرف اسکے مقرر کیے ہوئے ضابطہ کو ضابطہ تسلیم کرے، اور ہر اس طریقہ کو رد کردے جس کا اللہ کی طرف سے ہونا ثابت نہ ہو۔

اس عقیدہ کے دوسرے جز یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سلطانِ کائنات کی طرف سے روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبی کے ذریعے سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطۂ قانون بھیجا گیا، اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کرکے ایک مکمل نمونہ قائم کردینے پر مامور کیا گیا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس امر واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان ہر اُس تعلیم اور ہر اس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ اُسکو کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لیے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسول خدا سے ثابت ہے، اسکے سوا کسی دوسری دلیل پر اسکی اطاعت موقوف نہ ہو۔ رسول خدا کے سوا وہ کسی کی پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے، دوسرے انسانوں کی پیروی صرف اس حد تک ہو جس حد تک وہ رسول خدا کے پیرو ہوں، اور صرف اُن معاملات میں ہو جن میں اُنکے طریقہ کا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ماخوذ ہونا ثابت ہو جائے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کی کتاب اور اسکے رسول کی سنت کو حجت اور سند اور مرجع قرار دے، جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ وہاں سے ثابت ہو اسے اختیار کرے، جو وہاں سے ثابت نہ ہو اُسے ترک کردے، اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اُسے حل کرنے کے لیے اسی سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔ تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی یا قبائلی و نسلی، یا قومی و وطنی، یا فرقی و گروہی، کسی کی محبت یا عقیدت میں بھی ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسول خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آجائے یا اسکی مدمقابل بن جائے۔ رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اُس معیار کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اُس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اسکو اُسی درجہ میں رکھے۔

نصب العین

۲- جماعت اسلامی کا نصب العین اور اسکی تمام سعی و جہد کا مقصود دنیا میں، حکومت الٰہیہ کا قیام، اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

تشریح :- جہاں تک امر تکوینی کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ کی حکومت آپ اپنے زور پر قائم ہے اور اس سے بالاتر ہے کہ معاذ اللہ اُس کا قیام وبقاء بندوں کی مدد کا محتاج ہو۔ تمام مخلوقات خواہ ارضی ہوں یا سماوی، اسکے قہر وغلبہ سے مغلوب ہیں، اسکے زبردست قانون کی بندش میں جکڑی ہوئی ہیں، کسی میں اسکے حکم سے سرتابی کا یارا نہیں، اور دوسری مخلوقات کی طرح انسان بھی، خواہ مومن ہو یا کافر، اللہ کی تکوینی حکومت کے ماتحت محض ایک بندۂ مجبور ہے۔ لہٰذا حکومت الٰہیہ کے قیام سے مراد اللہ کی تکوینی حکومت کا قیام نہیں ہے، بلکہ دراصل اس سے مراد اللہ کی شرعی حکومت کا قیام ہے جسکا تعلق صرف انسان سے ہے، اور انسان کی زندگی کے بھی اُس حصہ سے ہے جس میں اللہ نے انسان کو اختیار عطا کیا ہے۔

انسان کی زندگی کا جو حصہ حیوانی وطبعی ہے اسکو تو اللہ تعالیٰ نے حکم تکوینی کے ماتحت رکھا ہے اور اس حصہ میں انسان دوسری تمام مخلوقات کی طرح بہر حال مسلم (مطیع) ہے، مگر جو حصہ انسانی ہے، یعنی جس میں انسان عقل اور تمیز استعمال کرکے خود اپنے ارادہ سے کام کرتا ہے، اس میں اللہ نے اسے آزادی عطا کی ہے کہ چاہے خود مختار بنکر کام کرے، چاہے اللہ کے سوا کسی اور کا بندہ بن جائے، چاہے خود خدائی کا مدعی بنکر دوسروں کو اپنا بندہ بنائے، اور چاہے تو اپنے اصلی مالک کو پہچان کر برضا ورغبت اسکی بندگی اختیار کرلے۔ یہ آزادی جو اللہ نے انسان کو عطا فرمائی ہے اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی ان چاروں صورتوں میں سے جو صورت بھی اختیار کرے وہ یکساں جائز اور حق ہے۔ نہیں، اس انتخاب واختیار میں آدمی کو آزاد چھوڑنے کا مدعا دراصل امتحان اور آزمائش ہے۔ جائز اور حق تو صرف یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اختیاری حصہ میں بھی اسی طرح اپنے خالق کا مطیع ہو جس طرح وہ اپنی زندگی کے غیر اختیاری حصہ میں اسکا مطیع ہے، کیونکہ حقیقت میں وہی ایک جائز فرمانروا ہے اور اسی کی اطاعت کائنات کے مجموعی نظام کے ساتھ ٹھیک مناسبت رکھتی ہے۔ لیکن اللہ نے اس حق پر انسان کو مجبور کرنے کے بجائے اُسے آزاد چھوڑ دیا ہے

تاکہ اگر وہ اس حق کو پہچانے اور آزادی رکھنے کے باوجود خود اپنی خوشی سے بندگی کا طریقہ اختیار کرے تو اُسے ابدی انعام سے سرفراز کیا جائے، اور اگر وہ اسے نہ پہچانے یا پہچاننے کے باوجود خواہشات نفس کا ایسا غلام ہو کہ مالک حقیقی کی اطاعت گوارا نہ کرے تو اسکو ابدی سزا دی جائے۔

چونکہ اس امتحان و آزمائش کی غرض سے اللہ نے انسان کو خود آزادی عطا فرمائی ہے اس لیے وہ اپنی فرمانروائی کا حق تسلیم کرانے کے لیے اپنی اُس قاہرانہ طاقت سے کام نہیں لیتا جسکو وہ اگر چاہتا تو پہلے ہی استعمال کر سکتا تھا اور چاہے تو ہر وقت استعمال کر سکتا ہے۔ جبر و زور سے مغلوب کرنے کے بجائے وہ حجت و برہان کے ساتھ نصیحت اور فہمائش کرنے کا طریقہ اختیار کرتا ہے، اور انسان کو سمجھاتا ہے کہ در حقیقت زمین و آسمان کا مالک میں ہوں، تو میری مخلوق اور میری رعیت ہے، اور تیرے لیے بھلائی اسی میں ہے کہ جو امر واقعی ہے اسکو تسلیم کر کے تو میرا مطیع فرمان بندہ بن جائے۔ اس فہمائش کے کام میں اللہ نے سب سے پہلے تو اُن انسانوں سے مدد لی ہے جنکو اس نے اپنا رسول مقرر کیا تاکہ وہ دلائل سے انسان کو حقیقت نفس الامر یعنی اللہ واحد ہی کے تنہا مالک و مدبر کائنات اور حاکم ذی اقتدار ہونے کا یقین دلائیں اور بطوع و رغبت اسکی اطاعت اختیار کرنے پر راضی کریں۔ پھر جو انسان رسولوں کی فہمائش سے حقیقت کو جان گئے ہوں اور جان کر اسکے پیرو بن چکے ہوں اُن سے اللہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم اس کام میں میری مدد کرو۔ چنانچہ قرآن میں بار بار فرمایا گیا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ (اے ایمان لانے والو! اللہ کے مددگار بنو) اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ (اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کریگا) وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ (اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اسکی اور اسکے رسولوں کی مدد کرتا ہے، در انحالیکہ اللہ پردۂ غیب میں چھپا ہوا ہے) وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ (اور اللہ ضرور ہی اسکی مدد کریگا جو اللہ کی مدد کریگا)۔ پس اللہ کی حاکمیت کا اقرار کرکے اور اسکی بندگی اختیار کرکے مومن کا کام ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اسکے بعد یہ خدمت اسکے سپرد کی جاتی ہے کہ وہ جاہل انسانوں کو اسی حقیقت سے واقف کرائے جس سے وہ خود واقف

ہوا ہے، اور باغی انسانوں کو اُسی حاکم اعلیٰ کی اطاعت پر آمادہ کرے جس کا وہ خود مطیع بنا ہے۔ اسی خدمت کی انجام دہی میں اللہ کی رضا ہے، اور اسی کے لیے اللہ اور مومن کے درمیان وہ معاہدہ عمل میں آتا ہے جسکی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ:-

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ	درحقیقت اللہ نے (اپنے کام کے لیے) مومنوں سے انکی جانوں
اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اور انکے مالوں کو خرید لیا ہے جسکے معاوضہ میں انکے لیے جنت ہے
فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ	وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں (اور اس لڑائی میں) مارتے بھی ہیں اور
وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ	مارے بھی جاتے ہیں (انکے معاوضہ میں جنت کا) وعدہ اللہ کے ذمہ ہے
فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ	اور یہ پکا وعدہ ہے جو توراۃ اور انجیل اور قرآن میں کیا گیا ہے اور
هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التوبہ - ۱۴)	اللہ سے بڑھکر اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟

لہٰذا اپنی اُس بیع پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اللہ کے ساتھ طے کی ہے کہ یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔

انسان کی زندگی کے اختیاری حصہ میں اللہ کے جس قانون کی اطاعت مطلوب ہے وہ اسکا قانونِ تکوینی نہیں بلکہ اُس کا وہ قانونِ شرعی ہے جو رسولوں کے واسطے سے آتا ہے اور اس قانون کا تعلق عقائد، اخلاق، معاشرت، تمدن اور سیاست وغیرہ سے ہے۔ محض تکوینی حیثیت سے اللہ کو خالق اور مدبر کائنات اور مالک ارض و سماء مان لینا کافی نہیں بلکہ سیاسی حیثیت سے اسی کو بادشاہ اور حاکم اور قانون ساز ماننا بھی ضروری ہے اور اسی کے بتائے ہوئے اصول اخلاق اور حدود قانون کی پیروی لازم ہے۔ اگر صرف تکوینی حیثیت سے کوئی اللہ کو مانتا ہو اور لاشریک مانتا ہو، لیکن انسانی زندگی کے اختیاری حصہ میں خود اپنے مختارِ مطلق ہونے کا دعویٰ کرے، یا زمین کے کسی حصہ پر اپنی حاکمیت کا مدعی ہو اور کہے کہ یہاں میں اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہونگا حکم چلاؤنگا (جیسا کہ نظام بادشاہی میں ہر بادشاہ، نظام آمریت میں ہر ڈکٹیٹر، نظام برہمنی و پاپائی میں ہر مذہبی پیشوا، نظام جمہوری میں جمہوریت کا ہر شہری کہتا ہے، اور جیسا کہ انفرادی زندگی میں ہر اُس شخص کا نفس کہتا ہے جو خدا کی اطاعت کا قائل نہ ہو)

(بقیہ بر صفحہ ۷۴)

اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاحِ عالم

از جناب حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی

(۲)

آمریت زمانہ قدیم کی مطلق العنان بادشاہت اور جمہوریت کے مجموعہ کا نام آمریت ہے۔ اسلیے یہ دونوں کے معائب کی حامل ہے۔ بادشاہی کے معائب کا اقرار تو اب ہر شخص کو ہے اسلیے انکے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جمہوریت کے عیوب انشاءاللہ آئندہ سطور میں تحریر کیے جائینگے۔ حیرت اُن مدعیانِ عقل و دانش پر ہے جو ایک طرف آمریت کے ایسے مہمل نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف اسکے بھی مدعی ہیں کہ ہم انسانیت کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں ح اس سے بڑھکر انسانیت کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت خود اپنے ہی جیسے ایک انسان کے ہاتھ میں بالکلیہ اپنی باگیں دیدے۔

چونکہ آمریت عقل اور فطرت کے خلاف چیز ہے اسلیے یہ کبھی معمولی حالات میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ اُن غیر معمولی حالات میں پیدا ہوا کرتی ہے جبکہ مصائب کے کسی شدید حملہ نے ایک قوم کے دماغی توازن کو بگاڑ دیا ہو۔ ایسے موقع پر اگر کوئی ہوشیار آدمی موجود ہوتا ہے تو وہ قوم کی بدحواسی سے فائدہ اٹھاکر عام جذبات میں اشتعال پیدا کرتا ہے، امیدوں کے سبز باغ دکھاتا ہے، اور اس طرح توجہات کو اپنے اوپر مرکوز کر کے آمرانہ اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔ اسکے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر قوم کے حواس برجا ہو گئے اور اسے سوچنے کی مہلت مل گئی تو اسکی آمریت

ختم ہو جائیگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر آمر اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے پیہم ہیجان انگیز کارروائیاں کرتا رہتا ہے تاکہ اسکی قوم کو کبھی سکونِ قلب کے ساتھ غور و فکر کا موقع ہی نہ ملے، اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا کے کل ڈکٹیٹروں کی تاریخ خونریزیوں اور لڑائیوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ اسکا نتیجہ علاوہ خونریزی، بدامنی اور بے اطمینانی کے یہ بھی ہوتا ہے کہ سوسائیٹی میں عقلِ سلیم کا نشو و نما رک جاتا ہے اور لوگوں میں اسکی صلاحیت ہی نہیں رہتی کہ معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جماعت کی فکری ہی نہیں بلکہ اخلاقی زندگی بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

علاوہ بریں آمریت کے نظام میں جماعت کا اخلاق شخصی اخلاق کے تابع ہو کر شخصی ہو جاتا ہے اور اس میں صرف آمر کی زندگی کا نمایاں خلق غالب ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قوام تمدن اور مزاج تہذیب کے قیام و بقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختلف اشخاص کے مختلف اخلاق و اوصاف جماعت میں نشو و نما پاتے رہیں تاکہ جماعت کا اجتماعی مزاج اعتدال سے تجاوز نہ کر جائے، جماعت زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کرسکے، اور اسکا کیرکٹر یک طرفہ (ONE SIDED) ہو کر نہ رہ جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آمریت جماعت کو جس سرعت کے ساتھ ایک ناپایدار ظاہری ترقی کی طرف لے جاتی ہے اس سے وہ چند زیادہ سرعت کے ساتھ وہ اسکو تنزل و ادبار کی طرف لیجاتی ہے۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ جماعت کے اجتماعی مزاج کو غیر معتدل بنا کر اسکی اخلاقی و فکری بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے اسلیے اسکی ترقی ہی اسکے تنزل و ادبار کا سبب بنجاتی ہے۔ بلکہ درحقیقت اسکی ترقی تنزل بصورت ترقی ہوتی ہے اور اسکا عروج بالکل اُس سُرخی کی طرح ہوتا ہے جو مریضِ دق کے چہرے پر نمایاں ہو جاتی ہے اور تیمارداروں اور خود مریض کو افزائش تندرستی و قوت کا فریب دیتی ہے۔

مزید یہ کہ آمر ہمیشہ ایسے افراد کو ابھرنے سے روکتا رہتا ہے جو اپنی قابلیت کی وجہ سے

اسکے مدِ مقابل ہو سکتے ہیں - اس طرح ایک طرف تو افراد میں اپنی فطری قوتوں کو نشو و ترقی دینے کا جذبہ دب جاتا ہے اور دوسری طرف جماعت ایسے اشخاص کی اعلیٰ صلاحیتوں کے فوائد سے محروم ہو جاتی ہے -

جمہوریت | دنیا کے سیاسی نظریوں میں جس قدر پر فریب اور پر تلبیس نظریہ جمہوریت ہے اس قدر کوئی بھی نہیں ہے - بظاہر یہ ایک جنت ہے جس میں خوف اور حزن کا نام و نشان بھی نہیں ہے، جس میں شخصی آزادی کی حفاظت ہوتی ہے، جس میں انسانیت کی قدر و قیمت پہچانی جاتی ہے اور جس میں غربت و امارت کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا - لیکن جب اسکے باطن پر نظر کی جائے تو یہ ایک جہنم نظر آتی ہے جس میں تکالیف اور پریشانیاں بھری پڑی ہیں، جس میں انسانیت کو کند چھری سے ذبح کیا جاتا ہے، جس میں شخصی آزادی کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور جس میں غریب اور کمزور کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے - جمہوریت کے تمام معائب کو یہاں مفصل طور پر بیان کرنا مشکل ہے، مگر اس کی چند نمایاں خرابیاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں جن سے اس فردوس نما دوزخ کی حقیقت معلوم کی جا سکتی ہے :

(۱) جمہوریت کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس میں اجتماعی ارادہ (General Will) کی فرمانروائی کو تسلیم کیا جاتا ہے - لیکن یہی چیز جمہوریت کی سب سے بڑی کمزوری ہے - اجتماعی ارادہ کسی مستقل اور پائیدار چیز کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک بڑی لوچ دار چیز ہے جو ہر پُر زور چیز سے دباؤ کھا کر اپنی شکل بدل دیتی ہے - اسکو دھوکا دیا جا سکتا ہے، اسکو لالچ دلایا جا سکتا ہے، اس کو مشتعل کیا جا سکتا ہے، اس کو بسا اوقات نہایت معمولی اسباب بھی متغیر کر دیتے ہیں - ایسی غیر مستقل چیز پر جس ریاست کی بنیاد قائم کی جائیگی اس میں استقلال اور پائداری کبھی نہیں پائی جا سکتی -

(۲) اجتماعی ارادہ کا ادبی، اخلاقی اور نفسیاتی تاثیرات سے متاثر ہونا یقینی ہے - ایسی حالت

میں ریاست کے لیے کوئی مستقل اخلاقی معیار اور قانون کے لیے کوئی پائیدار اخلاقی بنیاد نہیں رہتی اگر جمہور کے اندر برے میلانات نشو و نما پانے لگیں تو ریاست اور قانون نہ صرف یہ کہ ان کو روک نہیں سکتے بلکہ وہ اُنکے بقاء و ارتقاء کا ذریعہ بن جاتے ہیں، کیونکہ یہاں ریاست اور قانون دونوں خود جمہور اور انکے میلانات ہی کے تابع ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ باشندے اگر تباہی کی جانب ایک قدم چلتے ہیں تو ریاست انکو سو قدم دھکیلتی ہے۔ اس طرح انسانیت کی تباہی و بربادی کا راستہ مختصر ہو جاتا ہے۔ کل کی تاریخ اور آج کا مشاہدہ اس چیز کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ بداخلاقی اور بدکرداری نے جمہوریتوں کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ کس طرح ترقی کی ہے، جمہوریتوں نے کس طرح انکو ترقی دینے میں امداد و اعانت کی ہے، پھر کس طرح یہ بداخلاقیاں قوموں کی تباہی و بربادی پر منتج ہوئی ہیں۔ واقعہ صرف یہی نہیں ہے کہ جمہوریت اخلاق عامہ کے بگڑ جانے کے بعد ان اخلاق سیئہ کی اشاعت و اعانت کرتی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود جمہوریت اخلاق عامہ کی تباہی و بربادی اور انکی خرابیوں کو وجود میں لانے کا بہت بڑا اور یقینی سبب ہے۔ اسلیے کہ جمہوریت میں درحقیقت اخلاق کا کوئی مستقل معیار ہی نہیں باقی رہتا جسکو سامنے رکھکر جماعت یا افراد میں اخلاق حسن پیدا کی جائے۔ جمہور کی رائے کو اخلاق کا معیار قرار دیکر یہ امید رکھنا کہ جماعت میں اخلاق حسنہ باقی رہینگے سخت حماقت ہے۔ سوسائیٹی کی شرم انسان کو باہر اور کھلم کھلا بداخلاقیوں سے کسی نہ کسی حد تک روک سکتی ہے۔ لیکن خلوت میں روکنے سے وہ قطعاً قاصر ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ تخلیہ میں بداخلاقیوں کا ارتکاب جب ایک معتدبہ جماعت کرتی رہتی ہے تو رفتہ رفتہ بقیہ جماعت بھی اس سے متاثر ہوتی ہے اور مخالفین کی قوت خود بخود کمزور ہو جاتی ہے۔ آخرکار جمہور کے نزدیک بھی اس فعل میں کوئی شناعت باقی نہیں رہتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بداخلاقی خوش اخلاقی بنکر ریاست کی

اعانت و امداد حاصل کر لیتی ہے اور اسکے زیر سایہ پھل پھولکر دوسرے معائب و خبائث کو پیدا کرنیکا سبب بنتی ہے

(۳) جماعتی تعصب اور گروہ بندی جمہوریت کے لیے ایک لازمی و ضروری چیز ہے - اس مہلک مرض کا اثر یہ ہوتا ہے کہ حق گوئی و حق پسندی کا وصف لوگوں میں بالکل مفقود ہو جاتا ہے ایسی صورت میں قوم کی اخلاقی تباہی یقینی ہے - پھر یہی چیز جماعتی استبداد اور اکثریت کے ظلم تک منتج ہوتی ہے جو نظام جمہوری کی بدترین خصوصیت ہے اور جس کی وجہ سے یورپ میں متعدد جمہوریتیں پاش پاش ہوگئی ہیں -

(۴) قانون سازی کے اختیارات جمہوریتوں میں درحقیقت صرف برسر اقتدار جماعت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر ریاست کی کل جماعتیں قانون بنانے میں حصہ لیتی ہیں پھر اس برسر اقتدار جماعت میں بھی پارٹی ڈسپلن کا دہانہ ہر ایک کے منہ پر چڑھا ہوتا ہے جسکی وجہ سے حق کا دم اسکے حلق میں گھٹ کر نکل جاتا ہے - اسلیے اول تو اس میں اور آمریت میں کچھ زیادہ فرق باقی نہیں رہتا اور جمہور کا نام محض فریب دینے کے لیے لیا جاتا ہے، دوسرے یہ برسر اقتدار جماعت آخر انسانوں کی جماعت ہوتی ہے، فرشتوں کی جماعت نہیں ہوتی اسلیے اسکے وضع کیے ہوئے قوانین پر اسکے ذاتی رجحانات و تعصبات کا اثر پڑنا لازمی ہے - ایسی صورت میں عدل و انصاف کا معیار اس جماعت کے مفاد کے علاوہ کچھ نہیں رہجاتا - پھر یہ معیار بھی قطعاً غیر مستقل ہوتا ہے، اسلیے کہ جب دوسری پارٹی برسر اقتدار آتی ہے تو معیار اور نقطۂ نظر تبدیل ہو جاتا ہے - ان حالات میں شہریوں اور ریاست دونوں کو "امن و عیش" کہاں نصیب ہو سکتا ہے جب کہ ہر وقت "جرس" "بر بندید محملہا" کی آواز بلند کر رہا ہو -

(۵) طاقتور اور برسر اقتدار جماعت حزب مخالف (Opposition party) کو ہر ممکن طریقے

سے دبانے کی کوشش کرتی رہتی ہے ۔ اور اسکا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ مخالف پارٹی بھی اول الذکر کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہے ۔ اس وجہ سے جمہوریتوں میں باہمی تفرقہ کی آگ ہمیشہ سلگتی رہتی ہے اور اسکا خانہ جنگی تک منجر ہوجانا کچھ بعید نہیں ہوتا ۔

(۶) اجتماعی ارادہ چونکہ ایک تغیر پذیر شئے ہے اسلیے جمہوریتیں کبھی مستقل اور پائیدار اصولوں پر نہیں چلتیں بلکہ ان میں تلون اور ابن الوقتی کی شان پائی جاتی ہے اجسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ دوست ان پر اعتماد کرسکتے ہیں نہ دشمن ۔ انکے ساتھ معاملہ کرتے وقت کوئی بھی یہ بھروسہ نہیں کرسکتا کہ آج انکی جو پالیسی ہے کل بھی وہی قائم رہیگی ۔

(۷) اگر جمہوریت نظام سرمایہ داری کے ساتھ مخلوط ہو تو یہ ناگزیر ہے کہ حکومت و فرمانروائی صرف سرمایہ دار طبقہ کے قبضہ میں آجائے اور غربار کی قسمت میں ابدی محکومی و غلامی لکھدی جائے ۔ اسلیے کہ جمہوریت میں اقتدار اس جماعت کو حاصل ہوتا ہے جسکے پاس پروپیگنڈے کے ذرائع زیادہ ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ چیز دولتمندوں کو غریبوں کی بہ نسبت زیادہ میسر ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے ۔ چنانچہ مشاہدہ ہمارے اس بیان کی تائید کررہا ہے ۔ انگلستان میں جو جمہوریت کی محبت میں درجہ جنون سے بھی آگے بڑھ گیا ہے ، محض سرمایہ دار طبقہ کی فرمانروائی ہے اور یہی حال امریکہ اور تمام دوسرے جمہوری ممالک کا ہے ۔

(۸) جمہوریت کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اسکے اوپر جس ریاست کی بنیاد رکھی جاتی ہے اسکی پالیسی کا محور صرف معاشیات کو بنانا پڑتا ہے ۔ یہ ایک لازمی و ضروری چیز ہے جس سے کسی جمہوریت کو مفر نہیں ہے ۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی ارادہ جو جمہوری ریاستوں کا طاغوت مسجود ہے انفرادی ارادوں کے اجتماع سے وجود میں آتا ہے اور انفرادی ارادے جب خدا کی بندگی سے آزاد ہوں تو ان کا منتہائے مقصود صرف مطالبات نفس و بدن کا پورا کرنا ہوتا ہے جو معاشیات

کا سرچشمہ ہے۔ اسلیے ہر جمہوریت اس امر پر مجبور ہے کہ وہ معاشی مسائل کو اولیت و اولویت کا درجہ دے اور دوسرے مسائل کو محض انکے تابع سمجھے۔ زندگی کے ہر شعبہ کو معاشیات کے تابع کر دینے کا لازمی و لابدی نتیجہ وہ حیوانیت و بہیمیت ہے جسکا مشاہدہ آج دنیا کے اکثر حصہ میں ہو رہا ہے۔ اخلاقی حس کی موت، خدا سے بے نیازی بلکہ بیزاری، مادّہ پرستی کا غلبہ، یہ سب چیزیں اسی شکم پرستی اور عبدیت حرص وہوس کے ضروری اور لازمی نتائج ہیں جن سے نجات اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ جمہوریت کا وجود دنیا میں باقی ہے اور جب تک معاشیات کے بت کی پرستش اس عالم میں جاری ہے۔ جوزف اسٹالین نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "لوگوں کو مذہب و روحانیت سے بیگانہ اور متنفر بنانے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ان کو معاشیات کی جانب زیادہ سے زیادہ متوجہ کر دیا جائے"۔

معاشیات کے اس غلبہ کا دوسرا ضروری اور لابدی اثر یہ ہوتا ہے کہ جمہوریت کے ساتھ سرمایہ داری کا ناقابلِ انقطاع رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں ہر جگہ نظام سرمایہ داری اور نظام جمہوری ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی ملک میں نظام سیاسی جمہوری ہو اور معاشی نظام سرمایہ داری کے علاوہ کچھ اور ہو۔ اسلیے کہ جمہوریت کے معاملہ میں ذیل کی دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بہرحال ہوگی:

اول یہ کہ جمہوریت کے قیام سے بیشتر نظام سرمایہ داری موجود ہو۔ اس صورت میں یہ یقینی ہے کہ برسر اقتدار جماعت یا تو خود سرمایہ دار ہوگی یا کم از کم سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ہوگی۔ اسکی وجہ ہم سابق میں ذکر کر چکے ہیں اور مشاہدہ بھی اسکی تائید کرتا ہے، چنانچہ انگلستان کے جمہوری نظام میں بینک آف انگلینڈ کے ڈائرکٹر اور وزیر اعظم کی پوزیشن بالکل یکساں ہے بلکہ دستوری قانون کے ماہرین کی ایک بہت بڑی جماعت ڈائرکٹر کے عہدہ کو وزیر اعظم

کے عہدہ سے اہم تر خیال کرتی ہے۔ اسی طرح فرانس کے بینک (Banque de France) کا ڈائرکٹر فرانسیسی حکومت پر اس طرح حاوی رہتا ہے کہ حکومت اسکے اشارۂ چشم و ابرو کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ حکومت اگر اس سے نہیں نباہ سکتی تو اسے مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ قریبی دور کی فرانسیسی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ فرانسیسی کابینۂ حکومت میں روز روز کے تغیرات و انقلابات کس حد تک اسی بینک کے رہینِ منت رہے ہیں۔ بلکہ جرمنی کے مقابلہ میں فرانس کی موجودہ بے دست و پائی بھی اسی سرمایہ پرستی کی برکت ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جمہوریت کے قیام کے وقت نظام معاشی سرمایہ دارانہ نہ ہو بلکہ کوئی اور مثلاً اشتراکی ہو۔ ایسی صورت میں بھی یہ لازمی ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد نظام معاشی رفتہ رفتہ متغیر ہو کر سرمایہ دارانہ ہو جائے۔ اسلیے کہ اس صورت میں جو جماعت بھی جمہوریت میں بر سرِ اقتدار ہو گی وہ سرمایہ پر پورا قبضہ رکھیگی اور اس میں ایسے تصرفات کریگی جو اسکے مفاد کے مناسب ہوں۔ اگر شخصی سرمایہ داری نہ بھی ہو تو جماعتی سرمایہ داری تو یقینی ہے جو شخصی سرمایہ داری سے بھی زیادہ مضر ہے۔ پھر معاشیات سے واقفیت رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جماعتی سرمایہ داری ایک عرصہ کے بعد شخصی سرمایہ داری میں ضرور تبدیل ہو جاتی ہے اشتراکیت کے گہوارہ روس کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں سرمایہ داری کئی صورتیں بدل کر شخصی صورت میں واپس آگئی ہے۔

اس خالص معاشی ریاست و سیاست کے تباہ کن اثرات کا احاطہ مشکل ہے۔ اس سے جو اخلاقی بربادی ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن اسکا ایک نتیجہ عجیب و غریب ہوتا ہے جسکا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ خود اس جمہوریت و ریاست

کی بنیاد بھی کھوکھلی کر دیتی ہے جو اسکو وجود عطا کرتی ہے۔ قارونیت کا غلبہ انسان سے انسانیت کا جوہر سلب کر لیتا ہے۔ ایک سرمایہ دار کو صرف سرمایہ عزیز ہوتا ہے۔ نہ اسکو قوم کی پرواہ ہوتی ہے، نہ ملک کی نہ جماعت کی، اسلیے وطنیت و قومیت کے وہ تصورات جن پر عموماً جمہوریت کی بنیاد قائم ہوتی ہے سرمایہ دار کے ذہن سے قطعاً محو ہو جاتے ہیں، اور وہ ہر اس چیز کی اعانت و امداد کرتا ہے جس سے اسکے سرمایہ کی ترقی و حفاظت ہوتی ہو، خواہ اسکے نتیجہ میں ریاست، ملک، قوم سب تباہ و برباد ہو جائیں۔ انگلستان کا مشہور اہل قلم جان گنتھر اپنی کتاب "باطن یورپ" (Inside Europe) میں لکھتا ہے "فرانسیسی سپاہی کے سینہ میں جرمنی کی جانب سے جو گولی آکر لگی ہے بہت ممکن ہے کہ وہ فرانس ہی کے کسی کارخانہ کی بنی ہوئی ہو"۔ موجودہ جنگ کے متعلق قریبی زمانہ میں ایک خبر یہ بھی آئی تھی کہ جرمنی نے فرانس کے مقابلے میں جو بھاری ٹینک استعمال کئے تھے ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد خود فرانس کے بنے ہوئے ٹینکوں کی تھی۔ مسٹر چیمبرلین آنجہانی کی پالیسی جس نے جنگ کو بڑھانے کے لیے اس قدر تباہ کن بنا دیا اور جرمنی کی ہمتوں کو اسقدر بلند کر دیا اسی سرمایہ پرستی کا نتیجہ تھی۔ پولینڈ کے مقابلہ میں جرمنی کی اسقدر عاجل کامیابی اور پولینڈ کی تباہی کی ذمہ دار بھی وہاں کی سرمایہ پرست جماعت ہے جس کو جرمنی کی غلامی میں سرمایہ بڑھانا بہ نسبت آزادی کے زیادہ پسند آیا۔

(۹) اجتماع کے وجود میں آنیکے دو سبب ہوتے ہیں: کوئی عقلی اصول جو کل جماعت کا مقصد و مطمح نظر ہو جائے اور یہ مقصد و عقیدہ کی ہم آہنگی پوری جماعت کو متحد و مجتمع کر دے یا کوئی خاص جذبہ جو افراد میں ہم آہنگی پیدا کر کے ان میں ایک ہیئت اجتماعیہ کو وجود میں لانیکا سبب بنے۔ جمہوری ریاست میں چونکہ اصول کا معیار خود اجتماع ہے اسلیے اسکے سامنے کوئی

ایسا مستقل عقلی اصول وقانون نہیں ہوتا جو افراد میں مثبت اجتماعیہ پیدا کرکے جمہوریت کے وجود میں آنیکا سبب بنے۔ لہذا یہ لازم آیا کہ اس میں اجتماع کی بنیاد عقلی کے بجائے محض جذباتی ہو، جسکے مندرجہ ذیل نتائج یقینی ہیں:

(الف) جماعت میں عقلیت کے بجائے جذباتیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے اسکے قوائے عقلیہ روز بروز کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ نہ اسکا فکری نظام صحیح رہتا ہے نہ اخلاقی۔ اور رفتہ رفتہ وہ حیوانیت و بہیمیت کے درجہ پر پہنچ کر ذلت کے گڑھے میں اتر جاتی ہے۔

(ب) جذبات میں استقلال نہیں ہوتا اسلیے یہ اجتماع بھی سخت متلون اور سیماب وش ہوتا ہے۔ یورپ کی جمہوریتوں میں روز روز کے تغیرات و انقلابات اسکی نظیر میں پیش کیے جا سکتے ہیں یہانتک کہ انگلستان کا ایسا قدامت پسند اور رجعت پسند ملک بھی چھوٹے موٹے انقلابات کی آماجگاہ نو بن چکا ہے اور ایک بڑے انقلاب کی جانب بھی قدم بڑھا رہا ہے جیسا کہ وہاں کے ارباب سیاست کے اقوال سے باوجود سعی اخفا معلوم ہوتا ہے۔

(ج) جمہوریت میں ایک جماعت محض اس بنا پر دوسری جماعت پر صاحب اقتدار بنا دی جاتی ہے کہ وہ ثانی الذکر سے تعداد میں زیادہ ہے۔ یہ چیز جس قدر انصاف و عدل کے خلاف ہے وہ ظاہر ہے۔ عقل سلیم کسی صورت سے بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو سکتی کہ محض تعداد کی اکثریت حکمرانی و فرمانروائی کا حق پیدا کر دیتی ہے۔

فتلک عشرۃ کاملۃ۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ صرف ان دس معائب کے اظہار پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ جمہوریت کی خرابیاں اس سے کہیں زائد ہیں۔ اب میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں جو "اسلامی جمہوریت" کی لایعنی اصطلاح بڑے زور سے استعمال کیا کرتے ہیں کہ اسی پر از معائب جمہوریت کو آپ اسلام کے سر تھوپنا چاہتے ہیں؟ اور اگر یہ نہیں ہے

بلکہ جمہوریت سے آپ کوئی دوسرا مفہوم مراد لیتے ہیں تو کیا ضرورت ہے کہ آپ اسی لفظ کو اسلام کے ساتھ ملا کر گمراہ کرنیکا سبب بنیں۔ کیا "لا تقولوا راعنا الخ" کا حکم محض لفظ "راعنا" ہی کے استعمال تک محدود ہے؟ اور کیا یہ تلبیس الحق بالباطل نہیں ہے؟

جمہوریت، آمریت، اشتراکیت وغیرہ یہ سب خالص دنیاوی ریاست (Seculat State) کی قسمیں اور انسانی فرمانروائی (Human Sovereignty) کی مختلف صورتیں ہیں۔ انکو اسلامی ریاست اور خلافت الٰہیہ سے کیا نسبت جسکی بنیاد ہی انسانی حکومت کی نفی اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اثبات ہے۔ اسلیے اسلامی ریاست کی نظیر تلاش کرنا نہ صرف عبث بلکہ سخت گمراہی و ضلال بھی ہے۔ مگر ان مرعوب ماؤف ذہنوں اور دماغوں کو کیا کہا جائے جنھوں نے اسلامی مسائل کی حقانیت کا معیار مغربی خیالات سے انکے انطباق کو قرار دیدیا ہے۔ پھر اس کوشش میں واقعیت وغیر واقعیت سے انکو کیا بحث۔ اسلامی مسئلہ خواہ وہ مغربی اصول سے قطعاً متضاد ہی کیوں نہو، اور مغربی مسئلہ خواہ کتنا ہی لغو و مہمل کیوں نہو مگر انکا تو کام بس اتنا ہے کہ اسلام کو کھینچ تان کر اس پر منطبق کردیں، خواہ اس کوشش میں اسلام کے ٹکڑے ہی کیوں نہ اڑ جائیں۔ اس چیز کا نام انکے نزدیک مغربی سیاست سے واقفیت اور جدید علم کلام میں مہارت ہے۔

میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ بیشک آپکو اسکا حق حاصل ہے کہ اپنا جو مسلک چاہیں اختیار کریں۔ لیکن آپکو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ آپ اپنے ذاتی رجحانات و خیالات کو اسلام کی جانب منسوب کردیں؟ پھر اگر صحیح اسلامی خیالات آپکے نزدیک موجودہ دور میں ظاہر کرنے کے قابل نہیں ہیں اور آپ کو انکے اظہار سے شرم آتی ہے تو آپ صاف صاف اسلام سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟ اخلاقی جرأت اور دیانت کا اقتضاء تو یہی ہے۔

اگر آپ اسلام سے شرماتے ہیں تو اسلام آپ سے سو بار شرماتا ہے۔ اسکو کوئی پرواہ نہیں خواہ اسکا کوئی پیرو رہے یا نہ رہے۔ وہ خود ایک زندہ حقیقت ہے۔ اسکی زندگی ہمارے وجود کی محتاج نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی اسکے وجود کی محتاج ہے۔ اللہ اللہ مسلمانوں کے علماء تک کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ وہ اسلامی خیالات کو صحیح صورت میں ظاہر کرتے ہوئے شرماتے ہیں اور انکو کفر و ضلال کے ساتھ آمیز کرنا چاہتے ہیں ایسے ان سے پھر کہتا ہوں وَلَا تَلْبِسُوا الحق بالباطل و تکتموا الحق و انتم تعلمون ۞

غیر جمہوری سرمایہ دارانہ ریاست پر گفتگو اس موقع پر لاحاصل ہے اسلیئے کہ اسکی قباحت اظہر من الشمس ہو چکی ہے۔ نیز جمہوری سرمایہ دارانہ نظام کے قبائح پر جو روشنی ڈالی جا چکی ہے اسکے بعد اس موضوع پر الگ مستقل بحث کی حاجت نہیں۔

اشتراکی ریاست اسوقت جو غیر اسلامی نظریہ سب سے زیادہ گمراہی کا سبب بن رہا ہے وہ اشتراکیت ہے۔ اسکا اضلال اس حد پر پہونچگیا ہے کہ اب دینِ ابراہیمی و ملتِ حنیفی کے محافظین تک اسکے شکار ہو رہے ہیں اور بے سوچے سمجھے اس خلاف عقل و نقل نظام کی تائید میں کوشاں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قیامت کے دن جس پر انکا بھی ایمان ہے، جب ان سے یہ پوچھا جائیگا تو اسکا کیا جواب ان کے پاس ہوگا کہ کیا تم اسلام کو دین کامل نہ سمجھتے تھے؟ پھر کیا اسلام اور کفر کے علاوہ دنیا میں کوئی تیسری چیز بھی تھی؟ پھر جب تم نے اسلام کے سیاسی و معاشی نظام سے روگردانی کرکے ایک دوسرے نظام کو پسند کر لیا تو یہ ترجیح کفر علی الاسلام اور رضا بالکفر تھی یا نہیں؟ پھر رضا بالکفر اور ترجیح کفر علی الاسلام کا حکم تم کیا نہیں جانتے تھے؟ تم خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کی گمراہی کا سبب بنے کیا اسکا انجام تم کو معلوم نہ تھا؟ قسم ہے مالکِ عرش بریں کی ان سوالات کا کوئی جواب انکے پاس نہ ہوگا۔

اس سے پیشتر میں ترجمان القرآن کے صفحات میں ایک مبسوط مقالہ اشتراکیت پر لکھ چکا ہوں جس میں واضح دلائل سے اس نظریہ کا ابطال کیا گیا تھا، اسلیے یہاں اس پر زیادہ تفصیلی گفتگو کی تو کوئی حاجت نہیں ہے۔ البتہ کچھ مزید دلائل یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ان دلائل کو سمجھنے کے لیے یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اشتراکیت درحقیقت ایک معاشی نظریہ ہے اور مارکس نے اسکو اسی صورت میں پیش کیا تھا۔ لینن نے اس کی پیشینگوئی کو ایک سیاسی انقلاب کے ساتھ آمیز کرکے اس میں سیاست کی بُو پیدا کردی۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ اس کی سیاسی حیثیت کو ہم کسی حالت میں بھی اسکی معاشی حیثیت سے جدا کر سکیں۔ اسکی سیاسی حیثیت اسکی معاشی حیثیت پر موقوف ہے، اسلیے معاشی حیثیت کے انہدام کے بعد سیاسی حیثیت خود بخود فنا ہو جاتی ہے۔

اشتراکیت محنت و سرمایہ کو ایک ہی طبقہ کی ملکیت میں دیدیتی ہے، اور وہ طبقہ بھی محض جماعتی حیثیت سے سرمایہ و دولت کا مالک ہوتا ہے، ورنہ جماعت کا کوئی فرد حقوق ملکیت نہیں رکھتا بلکہ حکومت اس سے محنت لیکر اسکی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے اور وہی کل دولت کی مالک ہوتی ہے۔ اس صورت حال کا یہ نتیجہ لازمی ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد قانون تقلیل افادہ (Law of diminishing utility) کا عمل شروع ہو جائے۔ اس قانون کے اثرات میں آئندہ سطور میں تحریر کرونگا۔ پہلے اس امر کی وضاحت کرتا ہوں کہ اس قانون کا عمل ہونا کیوں ضروری ہے۔

مثال کے طور پر ایک اشتراکی ریاست کے ایک مزدور کے متعلق فرض کیجیے کہ وہ اوسطاً ۸ گھنٹے روزانہ کام کرتا ہے۔ محنت کی یہ مقدار اسکے لیے حکماً لازمی ہے۔ اور یہ محنت ایسی ہے کہ جس سے اسکی صحت و تندرستی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور حکومت کے لیے اسکا کام کافی مفید ہوجاتا

[redacted]

ہے - ۸ گھنٹہ کی محنت کا معاوضہ حکومت کی طرف سے اسکو یہ ملتا ہے کہ اسکو اسکی ضروریاتِ زندگی مہیا کر دی جاتی ہیں، مثلاً دو وقت کھانا، صبح کو ناشتہ، گرمی و سردی سے بچنے کے لیے کپڑے - ان ضروریات زندگی کو ہم سہولت کے لیے بصورتِ زر فرض کیے لیتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اسکو گویا ایک روپیہ روزانہ اجرت ملتی ہے - اب اگر وہ بالفرض ۹ گھنٹہ روزانہ کام کرنے لگے تو بھی اسکو وہی ایک روپیہ روزانہ اجرت ملیگی اسلیے کہ ایک روپیہ کے معنی اسکی ضروریات زندگی کے ہیں، اور ضروریات زندگی محدود ہوتی ہیں، ان میں بڑھنے اور گھٹنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اور اگر ہوتی ہے تو برائے نام جو ناقابلِ اعتبار ہے - اس صورت میں کوئی شخص اس پر رضامند نہ ہوگا کہ ۸ گھنٹے کے بجائے ۹ گھنٹے محنت کر کے خواہ مخواہ تکلیف اٹھائے لہٰذا سرمایہ کا وہ حصہ جو محنت کرنیوالوں کی ضروریات زندگی سے زائد ہے بالکل فضول ہو جائیگا اور اسکا افادہ ختم ہو جائیگا اسلیے کہ اسکے معاوضہ میں محنت نہیں حاصل کی جا سکتی، نہ اس سے کوئی فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے -

اب فرض کیجیے کہ کسی اشتراکی ریاست کی آبادی ۳۰ ہزار افراد پر مشتمل ہے جنکی محنت کا معاوضہ ایک روپیہ فی کس فی یوم کے حساب سے (عہ = ایک شخص کی ضروریات زندگی) ۳۰ ہزار روپیہ روزانہ ہے - اور ریاست کی آمدنی مثلاً ۴۰ ہزار روپیہ یومیہ ہے تو یہ ۱۰ ہزار روپیہ یومیہ کی بچت بالکل بیکار اور غیر مفید ہے - اس دولت سے محنت کرنے والوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی اور اسکا افادہ بالکل غائب ہو جائیگا -

اس قانون کے عمل میں آنے کے بعد اشتراکی حکومت ذیل کی دو صورتوں میں سے کوئی ایک اختیار کر سکتی ہے -

پہلی صورت تو یہ ہے کہ وہ اس کل غیر مفید اور زائد از ضرورت دولت کو کل پبلک پر

بحصہ مساوی تقسیم کر دے ۔ اس صورت میں چونکہ مختلف اشخاص کی ضروریات زندگی، نیز اخراجات مختلف ہونگے، کسی کے کم ہونگے اور کسی کے زائد، اسلیے معاشی اعتبار سے مختلف طبقات کا پیدا ہو جانا یقینی ولابدی ہے۔ خصوصاً اسلیے کہ محض ضروریات زندگی سے زائد دولت کا تقسیم کر دینا اس میں افادہ پیدا کرنیکے لیے کافی نہ ہوگا، بلکہ اسکے لیے پبلک کو تجارت کی اجازت دینا بھی ناگزیر ہوگا۔ نیز یہ کہ تقسیم دولت میں مساوات پیدا کرنے کے لیے اسکو زر کی صورت میں تقسیم کرنا پڑے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس زائد از ضرورت دولت کو تقسیم کرنے کے بجائے خزانہ ہی کی زینت بنایا جائے ۔ یہ صورت اول تو سخت احمقانہ اور ظالمانہ ہے ۔ دوسرے یہ کہ اس صورت حال کو محنتی طبقہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا، اسلیے کہ جب وہ دیکھے گا کہ اسی کی محنت سے مہیا کی ہوئی دولت تجوریوں میں مقفل ہے اور وہ برابر محنت و مشقت میں مصروف ہے تو وہ یقیناً اسکے خلاف بغاوت کریگا۔ ہڑتالیں، کارخانوں کو تباہ کرنے کی کوششیں (Sabotage) اور تعطل کی سازشیں شروع ہو کر ریاست کے امن و امان کو خاک میں ملا دینگی۔ اور اس وقت کسی منطق سے انکو اشتراکیت اور سرمایہ داری کا فرق نہ سمجھایا جا سکے گا۔ نیز اس صورت میں ایک اور خرابی بھی لازم آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس فضول دولت کو محفوظ رکھنے کے لیے ناگزیر ہوگا کہ اسکو زر کی صورت میں تبدیل کیا جائے، مگر ظاہر ہے کہ یہ مبادلہ اشتراکی حکومتوں سے تو ہو نہیں سکتا، اسلیے کہ وہ خود اسی قارونیت کی مصیبت میں گرفتار ہونگی، لہذا سرمایہ دار ممالک اور حکومتوں سے معاملہ کرنا پڑیگا۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اشتراکی حکومت کو تو کسی چیز کی خریداری کی احتیاج ہوگی نہیں اسلیے وہ اس زائد از ضرورت دولت کے معاوضہ میں صرف زر حاصل کریگی یا کم از کم زیادہ سے زیادہ مقدار زر طلب کریگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ زر کے یک طرف اجتماع سے لازماً دونوں ممالک

میں معاشی توازن بگڑ جائیگا۔

اب ایک دوسری حیثیت سے دیکھیے۔ انسان کی ضروریات زندگی محدود ہیں اور انکو پورا کرنے کے لیے کل آدمیوں کو مصروف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً سو آدمیوں کی ضروریات پوری کرنیکے لیے زیادہ سے زیادہ پچیس آدمیوں کی ضرورت ہے۔ اس طرح کہ مثلاً دس آدمی غذا مہیا کر سکتے ہیں، ایک آدمی گوشت دے سکتا ہے، ایک آدمی انکے کپڑے سی سکتا ہے، ۲ آدمی انکے لیے کپڑا بن سکتے ہیں، ایک آدمی روشنی کا انتظام کر سکتا ہے، ایک چوکیدار انکی حفاظت کا کام انجام دے سکتا ہے، دو آدمی انکے لیے پانی مہیا کر سکتے ہیں، سات آدمی اور متفرقات کے لیے رکھ لیجیے۔ اس طرح صرف پچیس آدمی سو آدمیوں کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لیے بالکل کافی ہیں۔ ایسی حالت میں اشتراکی ریاست ان پچھتر فیصدی بیکار اشخاص کے لیے کیا کریگی ؟ مجبوراً انکو کام مہیا کرنیکے لیے اسباب تعیش (Luxuries) تیار کرانا ضروری ہونگے اور نہ صرف تیار کرانا ہونگے بلکہ پبلک کو ان کے استعمال کی عادت بھی ڈالنی ہوگی ایسکے جو اخلاقی اور نفسیاتی اثرات ہونگے اور یہ جسطرح تباہی و بربادی کی طرف منتج ہوگا وہ بالکل ظاہر ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اشتراکیت کے لیے دو چیزیں لازمی ہیں جو اسکے وجود سے کبھی منفک نہیں ہو سکتیں۔ اول تو قلیل ہی عرصہ میں اس کا سرمایہ داری میں تبدیل ہوجانا۔ دوسرے اس کا اخلاقی و روحانی بربادی پیدا کرنا۔ پس حیرت و افسوس ہے ان اسیران دام اشتراکیت پر جو اشتراکیت کو دنیا کے لیے آیۂ رحمت سمجھتے ہیں اور اسکو رواج دینے کے لیے کوشاں ہیں اور انما نحن مصلحون کے نعرے لگاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں "الا انھم ھم المفسدون ولکن لا یشعرون ؕ"

نظریۂ خلافت الٰہیہ | ریاست کے غیر اسلامی نظریات مع انکے معائب اور نقائص کے گذشتہ صفحات میں پیش کیے جا چکے ہیں - انکے نقائص اور معائب کو دیکھ کر ہر شخص انکے وجود کو دنیا اور اہل دنیا کے لیے ایک مصیبت عظمیٰ اور لعنت کبریٰ سمجھیگا - بلاشبہ دنیا کے اوپر جو مصیبتیں آرہی ہیں وہ زیادہ تر انہیں غلط اور غیر اسلامی افکار سیاسی و اصول معاشی کی رہین منت ہیں - ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیا کو ان مصائب سے نجات دلانیکا عزم کریں اور اسکے لیے اپنی عمر کا ہر لمحہ اور اپنے خون کا ہر قطرہ وقف کردیں - مسلم ہونیکے معنی یہ ہیں کہ ہم نے صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ کے احکام کے آگے اپنا سر تسلیم خم کردیا اور صرف اسی کی بادشاہت و سلطنت کو تسلیم کرکے دنیا کے ہر بادشاہ، ہر حاکم، ہر سلطان کی حکومت و سلطنت کی نفی کردی - اسلیے یہ ناممکن ہے کہ ہم مسلم ہوتے ہوئے غیر اللہ کی حکمرانی اور غیر اللہ کی حکومت تسلیم کریں، یا غیر اللہ کے بنائے ہوئے کسی نظام حیات اور کسی اصول زندگی کو قبول کرلیں، یا انکے وجود کو جینے جی گوارا کرلیں۔ نفی کا اقتضاء یہ ہے کہ ہم ہر غیر اسلامی اور غیر الٰہی حاکمیت و فرمانروائی کو صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹادیں، اور اثبات کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حکومت اُسکی زمین میں قائم کردیں۔ ان دونوں فرضوں میں سے اگر ایک میں بھی کوتاہی ہو تو یقیناً ہم گناہگار اور سخت گناہگار ہیں بلکہ ہمارے اسلام میں کمی اور کمزوری ہے - یقیناً جس طرح غیر اسلامی نظام حیات اور غیر الٰہی حاکمیت و فرمانروائی کا قبول کرنا اور اسکو رائج کرنیکی کوشش کرنا جرم عظیم اور علامت ضعف ایمان ہے، اُسی طرح اسکے خلاف جدوجہد نہ کرنا اور خاموشی و سکوت کے ساتھ اسکو گوارا کرلینا بھی سخت جرم اور بہت بڑا گناہ ہے - پھر خلافت الٰہیہ کے قیام اور اس نظریہ کی قبولیت کے لیے وقت بھی موزوں ترین ہے - شائد دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا ہے جو خلافت اسلامیہ کی مقبولیت کے لیے موجودہ دور سے زیادہ موزوں و مناسب ہو - اسلیے کہ دنیا اس وقت خود

غیر اسلامی نظریات و اصول سے عاجز و پریشان ہے اور بدل متمنی ہے کہ کوئی نیا نظام رواج پذیر ہو کر اسکے مصائب کا خاتمہ کردے اور اسکو راحت و سکون سے ہم آغوش کرے۔ تحریک اسلام کے لیے وقت کی یہ موزونیت و مناسبت ہماری خاموشی و بے عملی کے جرم کو اور بھی سنگین بنا دیتی ہے۔

مقام حیرت و غیرت ہے کہ ایک نازی بالکل ناسازگار و ناساعد حالات میں اپنے وطن سے باہر جاکر نازی ازم کا پروپیگنڈا کرتا ہے اور کسی نہ کسی حد تک اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ ایک اشتراکی سرمایہ پرست ممالک میں جاکر اشتراکیت کی تبلیغ کرتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ مگر ایک مسلمان اتنے سازگار و ساعد حالات میں بھی زبان سے کلمہ حق نکالتے ہوئے اور نظریہ خلافت الٰہیہ کی تبلیغ کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ حالانکہ دونوں نظریوں میں بہت بڑا فرق ہے نازیت، اشتراکیت وغیرہ کل غیر اسلامی نظریات کی حالت یہ ہے کہ انکی بنیادیں کھوکھلی اور کمزور ہیں، انکے فوائد سطحی، وقتی اور قلیل، انکے مضار و معائب بیحد و بیحساب، اور انکا نتیجہ آلام، مصائب، تباہیاں اور پریشانیاں۔ اسکے بالکل برعکس اسلامی نظریہ کی بنیاد مضبوط مستحکم اور ٹھوس منطقی دلائل پر قائم ہے، اسکے فوائد بے حد و حساب، اور مضرت سے اسکا دامن بالکل پاک ہے، اور اس کا نتیجہ دائمی امن و سلامتی ترقی و خوشحالی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے لیے اسکی ترویج ضروری ہو جاتی ہے نہ کہ کسی قومی عصبیت کی بنا پر۔ لاریب انتہائی ننگ انسانیت اور حد درجہ بد دیانتی کا فعل ہوگا اگر ہم بنی نوع انسان کو گوناگوں مصائب دنیوی میں مبتلا اور ہلاکت وعذاب آخرت کی طرف جاتے ہوئے دیکھکر خاموش بیٹھے رہیں اور وہ نسخہ کیمیا ان کو نہ بتائیں جو فلاح و سعادت کا یقینی اور واحد ضامن ہے۔

ذیل کی سطور میں ہم خلافت اسلامیہ کا ایک مجمل خاکہ پیش کرتے ہیں اور دنیا کے ہر اس شخص کو اسکی طرف دعوت دیتے ہیں جس میں انسانیت کا ایک ذرہ بھی باقی رہ گیا ہے۔ غو

وہ جرمن ہو یا جاپانی، ترکی ہو یا ایرانی، اطالوی ہو یا برطانوی، ہندو ہو یا بودھ، عیسائی ہو یا یہودی یا دورِ موجودہ کا نسلی مسلمان خواہ کانگریسی ہو یا مسلم لیگی، ہم سب سے نہایت پُرزور الفاظ میں پورے علم و یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ جمہوریت، نازیت، فاشیت، اشتراکیت وغیرہ کے طلسمات کو توڑ دو اور انسانی حاکمیت کو لات مار کر خدائے واحد قدوس کی حکومت اس عالم آب و گل میں قائم کر کے خلیفۃ اللہ فی الارض کا مرتبہ عظمیٰ حاصل کرو۔ اور یہ سب ہم اپنے کسی ذاتی نفع کے لیے نہیں کہتے، کسی قومی عصبیت، کسی ملکی تعصب، کسی نسلی تفوق کی بنا پر نہیں کہتے، بلکہ محض تمہاری ہی ہمدردی کی بنا پر اور تم کو دنیا کی تباہی اور آخرت کے عذاب الیم سے بچانے کے لیے کہتے ہیں۔ آئندہ تم کو اختیار ہے فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔

ریاست و حکومت کا اسلامی تصور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے دنیا کے کل سیاسی تصورات سے بالکل انوکھا ہے۔ اسلام انسانی حکومت و فرمانروائی کا قائل نہیں ہے بلکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے اور محض قائم ہی نہیں کرنا چاہتا بلکہ تخلیق انسانی کی غرض و غایت اسی استخلاف فی الارض کو قرار دیتا ہے۔ قولہ تعالیٰ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔ اس طرح وہ انسانیت کی قدر و عزت کو بلند ترین مرتبہ پر پہونچا دیتا ہے۔

اسلام کی روح ارتقاء عروج ہے۔ مگر وہ وہمی اور عارضی ارتقاء نہیں جو غیر مسلمین کا نصب العین اور منتہائے فکر ہے بلکہ وہ ارتقاء جو گہوارہ سے شروع ہو کر عالم آخرت تک جاری رہتا ہے اور جس کی حد و نہایت متعین نہیں ہے۔ غیر اسلام میں ارتقاء و عروج کا تخیل بالکل محدود ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ انسان کی موت تک جاری رہتا ہے لیکن اسلام اسکو غیر محدود بتاتا ہے اور موت کے بعد (جو اسکے نزدیک فنا کا نہیں بلکہ حیات ثانیہ کا نام ہے) بھی جاری

رہتا ہے۔

انسان اپنے ابتدائے وجود سے ایک راستہ پر گامزن ہوتا ہے جو مختلف منازل سے گذرتا ہوا منزلِ آخرت کو جاتا ہے۔ یہ راستہ ترقی کا راستہ ہے بشرطیکہ آدمی اسلامی اصول و قوانین کی پابندی کے ساتھ اس پر گامزن ہو۔ اسلامی اصول یہ بتاتے ہیں کہ کس طرح اور کس نیت وغرض سے اس راستہ کی ہر چیز کو استعمال میں لایا جائے تاکہ ہر منزل ترقی وعروج کی منزل بن جائے۔ یہانتک کہ انسان ترقی کے اس اعلیٰ درجہ پر پہنچ جائے جسکا نام جنت ہے، جو اپنے علو وبلندی نیز دائمی وابدی ہونے کی وجہ سے منتہائے نظر ہونیکا مستحق ہے۔ تمدن وعمران کی ترقی، علوم وفنون کی ترقی، معاشی واقتصادی ترقی، اخلاقی ونفسیاتی ترقی، ذہنی وفکری ترقی، آلاتی و میکانکی ترقی، الغرض وہ کل ترقیاں اسلام کے مقاصد میں داخل ہیں جو حقیقت میں ترقیات ہوں نہ کہ تنزلات، جو انسان کو اوپر لے جائیں نہ کہ نیچے، جو ترقی کے مرتبہ اعلیٰ کے حصول کے لیے ذریعہ بن سکیں نہ کہ اسکی راہ میں حجاب و مزاحم بنجائیں، اور جو فلاح وسعادت کی موجب ہوں نہ کہ خسران وشقاوت کی۔

ترقی وعروج کی ان تمام اقسام کے حصول کے لیے یہ لازمی وضروری ہے کہ انسان کائنات کا صحیح استعمال کرے، ہر چیز کے مفید پہلو سے فائدہ اٹھائے اور مضر پہلو سے اجتناب کرے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ انسان اپنے صحیح مرتبہ اور دوسری مخلوقات عالم کے صحیح درجہ سے واقف ہو، پھر کچھ ایسے قوانین کا پابند ہو جو تمدن وعمران، معاش واخلاق، ذہانت وتفکر، علم وادراک کے ان منازل ارتقاء کو باقی رکھ سکیں جو انسان کو حاصل ہو چکے ہوں اور ان مراتب کو آئندہ مراتب ارتقاء کے حصول کا ذریعہ بنا سکیں۔

"خلافت الٰہیہ" کا نظریہ ارتقاء وعروج کے ان دونوں ضروری عناصر کو مجتمع کر دیتا ہے:

انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض قرار دے کر اسلام نے ایک طرف تو کائنات میں انسان کی صحیح حیثیت اور موجودات کے ساتھ اسکے تعلق کی صحیح نوعیت متعین کردی ہے، اور دوسری طرف اسکے لیے موجودات میں تصرف کا صحیح طریقہ بھی معین کردیا ہے، کیونکہ جب انسان اللہ کا خلیفہ ہے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ یہاں مالک مختار کی حیثیت سے کوئی تصرف کرنیکا مجاز نہیں ہے بلکہ اسے تمام تصرفات اصل مالک کے مقرر کیے ہوئے قانون کے مطابق کرنے چاہییں۔ خلیفۃ اللہ ہونے کے بعد انسان سمجھتا ہے کہ کل کائنات عالم اسکے فائدہ اور نفع کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اُس کا یقین "وَخَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" اور "وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ" اور اسی قسم کے دوسرے پیغاماتِ الٰہیہ پر ہوتا ہے۔ اسلیے وہ کائنات کے ذرہ ذرہ پر غائر نظر ڈالتا ہے، عالم خلق کے چپہ چپہ کو کھنگال کر استعمال میں لاتا ہے تاکہ "ربنا ما خلقت هذا باطلا" کے مخوٰی پر عمل ہو جائے۔ پھر وہ اس سب مخلوقات کو ارتقاء کے مرتبہ عظمیٰ یعنی ترقی آخرت کے لیے ذریعہ اور وسیلہ بناتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمدن و عمران، علوم و فنون، فکر و ادراک، غرض ہر میدان میں پیش قدمی کا صحیح رخ متعین ہو جاتا ہے۔

نظریۂ خلافت انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان نوعیت کا فرق قائم کردیتا ہے۔ دوسری مخلوقات کے لیے صرف قانون طبیعت (Law of Nature) کی پیروی ہے، اور اس پیروی میں ان کے لیے محض جبلّت (Instinct) کی ہدایت کافی ہے۔ لیکن انسان ان کے برعکس خلیفہ یا نائب کی حیثیت رکھتا ہے، اس کو دوسری مخلوق پر تصرف کے اختیارات دیے گئے ہیں، اس کو تمیز اور استدلال اور استنتاج اور تفکر کی قوتیں دی گئی ہیں، اور وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا ذمہ دار و جواب دہ عہدہ دار ہے، اس لیے اس کا کام محض تکوینی قوانین اور طبیعی اصول کی پیروی نہیں ہے، بلکہ اُن سے زائد ایک تشریعی قانون، ایک اخلاقی ضابطہ اور ایک جلی ہدایت

کی پیروی کرنا بھی اس پر لازم ہے ، بلکہ اسکی فلاح وسعادت کا انحصار اسی دوسری چیز کی پیروی پر ہے۔ اسکی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک حکومت کی سول سروس کا کام محض اُن قوانین کی پیروی کرنا ہی نہیں ہے جو عام رعایا کے لیے بنائے گئے ہوں ، بلکہ ان کو حکومت بالادست کی ہدایات اور ضابطۂ ملازمت (Government Servants Conduct Rules) کی پیروی بھی کرنی پڑتی ہے ، اور ان کی کامیابی وترقی کا انحصار در اصل اسی دوسری چیز کی پیروی پر ہوتا ہے۔ پس انسان کے لیے محض قوانین تکوینیہ کی اساس پر سعی وعمل اور ترقی وعروج کا کوئی ایسا پروگرام اور نظام نہیں بنایا جاسکتا جو سفر زندگی کی ہر منزل اور حیات کے کل شعبوں میں اسکی رہنمائی کے لیے کافی ہو ، اور جسکا اتباع کر کے آدمی ترقی کی دنیوی منزلوں سے سلامتی کے ساتھ گذرتا ہوا آخرت کی انتہائی منازل ترقی تک پہنچ سکے۔ اسکی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ عالم خلق میں سرے سے وہ ضروری مواد Data ہی موجود نہیں ہے جس سے آدمی بطور خود اس پروگرام اور نظام کو اخذ کر سکے ، اور اسکی وجہ صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ آدمی کے ذرائع استدلال واستنتاج اس ضابطہ کو معلوم کرنے کے لیے ناکافی ہیں ، بلکہ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سفر زندگی کی آخری منزل جس کے نتائج پر ہماری کامیابی وناکامی اور ترقی وتنزل کے اصلی فیصلہ کا دار ومدار ہے ، ہماری نگاہ سے قطعی اوجھل ہے اور ہم بطور خود کسی طرح بھی یہ نہیں جان سکتے کہ وہاں ہمارے کس دنیوی عمل کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ لہذا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انسان کو زمین پر اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے لیے جس پروگرام اور نظام کی ضرورت ہے وہ لازماً خداوند تعالیٰ کی طرف سے واضح ہدایت یا بالفاظ دیگر وحی کے طور پر آنا چاہیے۔

اس طرح انسانی ارادہ ارادۂ الٰہی کے ، اور انسانی تعقل علم الٰہی کے تابع ہو جاتا ہے جسکا ایک اثر تو یہ ہوتا ہے کہ انسان کی قوتِ ارادی اور قوتِ تصرف میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے

کیونکہ ہر قدم پر وہ محسوس کرتا ہے کہ فرمانروائے عالم کی طاقت اسکی پشت پر ہے۔ دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ ترقی کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے، کیونکہ ہر اساسی اہمیت رکھنے والے مسئلے میں انسان کو صحیح رہنمائی مل جاتی ہے اور اسکی قوت غلط تجربات میں ضائع نہیں ہوتی۔ تیسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان ان تمام نقصانات سے محفوظ رہتا ہے جو انسانی حاکمیت کے بے اصل مفروضہ پر کام کرنے کی صورت میں لازماً پہنچتے ہیں۔ اس میں نہ طبقاتی کشمکش ہوتی ہے نہ سرمایہ دار و مزدور کی آویزش نہ پارٹی بندیاں ہوتی ہیں نہ فرقہ پرستیاں، نہ خونریزیاں ہوتی ہیں نہ ہلاکت آفرینیاں، اسلیے کہ یہ سب تو انسانی حکومت کے نتائج ہیں، حکومت الٰہیہ میں انکا وجود کہاں؟ ان خرابیوں کے بالکل برعکس وہاں ایک ایسے تمدن کی تعمیر ہوتی ہے جسکا ہر جزو انتہائی ترقی یافتہ اور جس کا ہر حصہ امن و سلامتی اور راحت و اطمینان کا ضامن ہوتا ہے۔

آزادی و مساوات کا حقیقی وجود صرف حکومت الٰہیہ ہی میں ممکن ہے، اسلیے کہ وہاں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کے خیالات، اعمال و افعال کسی فرد یا جماعت کے تابع نہیں ہوتے، بلکہ صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ کے احکام و تعلیمات کے تابع ہوتے ہیں۔ اخلاق کے حسن و قبح کو تمدن کے فنا و بقا میں بہت بڑا دخل ہے۔ اسلامی حکومت کی بنیاد ہی اصلاح اخلاق پر قائم ہے۔ حکومت الٰہی نہ صرف یہ کہ اظہار گناہ سے مانع ہوتی ہے بلکہ اندھیری کوٹھڑی میں بھی برے اخلاق و افعال کے ارتکاب کو روکتی ہے۔ گناہوں کی روک تھام وہاں ظاہر ہی میں نہیں ہوتی بلکہ باطن میں بھی ہوتی ہے، اسلیے کہ خدا کی حکومت اُن اخلاقی بنیادوں کو منہدم کر دیتی ہے جن پر بدکرداریوں کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست میں قانون سازی کے اختیارات انسان کو نہیں حاصل ہوتے، نہ کسی فرد کو نہ کسی جماعت کو، بلکہ سب کو قانونِ الٰہی کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ اسکا ایک بہت بڑا فائدہ

یہ ہوتا ہے کہ حکومت اور پبلک میں یک جہتی اور باہمی تعاون وہمدردی کی روح پیدا ہو جاتی ہے جس سے ریاست دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی ہے۔ علاوہ بریں قوانین کے اجرار و تنفیذ میں کوئی دشواری نہیں پیدا ہوتی اسلیے کہ سوسائیٹی کے افراد میں اطاعت کا داعیہ خود موجود ہوتا ہے اور قانون الہٰی کی اطاعت کی جانب اس عام رجحان کی وجہ سے جو فضا پیدا ہوتی ہے اس میں خود بخود مطیع اور پابندِ قانون اشخاص پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

قانون کے اجرار و تنفیذ کے اختیارات بے شک ہیئت انتظامیہ، یعنی حکومت ہی کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، اور حکومت میں بھی ایک شخص، یعنی خلیفہ یا امیر کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے، لیکن سب سے بڑا بنیادی فرق جو اس حکومت کو دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں حکومت ایک متقی سوسائیٹی کے اندر بنتی ہے اور انتظامی کاموں کے لیے عاملین کا انتخاب اہلِ تقویٰ لوگوں میں سے کیا جاتا ہے۔ برعکس اسکے دوسری حکومتیں اُس سوسائیٹی میں بنتی ہیں جس میں تقویٰ کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ اس فرق کی وجہ سے انتظامی اختیارات ایک شخص یا چند اشخاص کے ہاتھ میں دینے کے جو نتائج غیر متقی سوسائیٹی میں ظاہر ہوتے ہیں وہ متقی سوسائیٹی میں ظاہر نہیں ہوسکتے۔ پھر یہ اختیارات جو عاملین حکومت کو دیے جاتے ہیں، یہ بھی غیر محدود نہیں ہیں۔ جن امور میں شرع کے احکام صریح ہیں ان میں حکومت کی حیثیت ایک آلۂ تنفیذ سے زیادہ نہیں ہے۔ اور جو امور ان کے ماسویٰ ہیں ان میں اول تو حکومت کو مشورے کا پابند کیا گیا ہے، دوسرے اسلامی شعور رکھنے والی پبلک کو محاسبہ اور تنقید کے پورے اختیارات دیے گئے ہیں۔ اسلام لوگوں میں یہ اسپرٹ پیدا کرتا ہے کہ وہ حکمرانوں کے اعمال کو غور سے دیکھتے رہیں۔ جب تک وہ خدا و رسول کی ہدایت پر چل رہے ہوں، اُنکی پوری اطاعت کریں، جب اُن کا

رویہ مشکوک ہو تو محاسبہ کریں، تنقید اور نصیحت سے اصلاح کی کوشش کریں، اور جب انکو اتنا منحرف پائیں کہ دین میں فساد کا خطرہ ہو تو انہیں معزول کر دیں۔

خلافت الٰہیہ کا مقصد مندرجہ بالا سطور پڑھنے کے بعد قیام خلافت الٰہیہ کا مقصد خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ لیکن ہم اسکے ماخذ کے ساتھ اسکا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ شک و ریب کی گنجائش نہ رہے۔ قرآن مجید مندرجہ ذیل الفاظ میں خلافت اسلامیہ کے مقاصد کا تذکرہ کرتا ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ

(وہ لوگ ایسے ہیں) کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کرینگے اور زکوٰۃ دینگے اور اچھے کاموں کا حکم کرینگے اور برے کاموں سے روکینگے۔

اس آیت میں قیام خلافت کے چار مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ۔ ایتاءِ زکوٰۃ امر بالمعروف۔ نہی عن المنکر۔ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد صرف نماز ہی پڑھنا نہیں ہے بلکہ کل عبادات بدنیہ اپنے اپنے درجات کے اعتبار سے اس میں داخل ہیں۔ اسی طرح ایتاءِ زکوٰۃ سے مراد محض زکوٰۃ دینا ہی نہیں ہے بلکہ پورے معاشی نظام کو اسلامی معیار و اصول پر قائم کر دینا بھی اس میں داخل ہے۔ رہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تو پہلے ترقی کی حقیقت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے پیش نظر رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ ہر معروف انسان کی حقیقی ترقی میں معاون اور ہر منکر اسکی ترقی میں مانع ہے۔ پس دوسرے الفاظ میں خلافت الٰہیہ کے قیام کے مقاصد یہ ہیں: عبد و معبود کے تعلق کو مضبوط و مستحکم بنانا اور بنی نوع انسان کو صحیح معنوں میں خداوند عالم کا بندہ بنانا، دنیا کے معاشی نظام کو درست کر کے ایسی حالت پر قائم رکھنا جس میں نہ اجتماعی قارونیت کا وجود ہو سکے نہ شخصی قارونیت کا، اور نہ فاقہ کشی و غربت کے دلگداز نظارے دیکھنے میں آئیں۔

نوعِ انسانی کو ہر شعبہ زندگی میں ارتقاء و عروج کی طرف بڑھانا اور اس راہ میں جو موانع ہوں انکو دور کرنا۔

خلافت الٰہیہ کا مفہوم اور مقصد معلوم کرنیکے بعد غالباً مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی وہ غلط فہمیاں رفع ہو جائینگی جو وہ تحریک اسلام اور اسلامی ریاست و حکومت کے متعلق رکھتے ہیں۔ غیر اسلامی ماحول میں عرصہ دراز سے پرورش پانے کی وجہ سے غیر مسلم تو غیر مسلم اخود مسلمان بھی اسلامی حکومت کے متعلق بہت زیادہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ عوام تو عوام خود علماء اسلام میں بھی ریاست کے اسلامی تصور اور اسکے اصول و مقاصد پر نظر رکھنے والے شاذ و نادر ہی ہونگے۔ مسلمانوں کے ذہن میں اسلامی حکومت کا جب تصور آتا ہے تو انکی آنکھوں کے سامنے زمانہ سابق کے مسلمان بادشاہوں کی مطلق العنان فرمانروائی، یا زمانۂ حال کے اتاترک اور عصمت انونو کی جمہوریت کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ ہم حاکم مطلق ہونگے خوب داد عیش دینگے اور ہمارے ماتحت جو قومیں ہونگی انکے ساتھ جو چاہینگے سلوک کرینگے۔ حالانکہ اسلامی حکومت کا اگر یہ مفہوم ہو تو اس میں اور غیر اسلامی حکومت میں کوئی فرق نہیں۔ یہی غلط فہمی ہے جسکی بناء پر ہندوستان کا مسلمان یہ ؟انہ خیال رکھتا ہے کہ غیر اسلامی طریقے اختیار کرکے، شعائر اسلامی کو پامال کرکے، مغربی معاشرت و تمدن اختیار کرکے، عورتوں اور مردوں کی مخلوط تعلیم رائج کرکے، بے حیائی و بے غیرتی کی اشاعت کرکے، اور سر سے پیر تک غیر اسلامی بنکر بھی وہ اسلامی حکومت قائم کر سکتا ہے۔ رہے غیر مسلم تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کے معنی مسلمان نامی ایک قوم کے دوسری قوموں پر حکمراں بن جانے کے ہیں۔ یہ ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت و... ہی ایک بدمزہ چیز ہے جس کا کوئی بھی برضا و رغبت خیر مقدم نہیں کر سکتا۔ مگر جب وہ اپنے ہمسایہ مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کو دیکھتا ہے تو اس خیال سے اسکی روح کانپ

جاتی ہے کہ یہ مالک الملک اور ہم رعیت ہوں تو ہمارا حشر کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو اخلاق و اعمال ہندوؤں اور سکھوں اور دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں انکو دیکھتے ہوئے کوئی غیر قوم ہندو یا سکھ حکومت کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتی۔ بالکل اسی طرح اسلامی حکومت کو مسلمانوں کی قومی حکومت، اور وہ بھی اِن مسلمانوں کی حکومت سمجھنے کے بعد غیر مسلموں میں اس سے وحشت بلکہ نفرت ہونا کوئی خلافِ توقع امر نہیں ہے۔

ان غلط فہمیوں نے تحریکِ اسلام اور دعوتِ خلافتِ الٰہیہ کی راہ میں سخت رکاوٹ پیدا کردی ہے۔ گذشتہ سطور ان غلط فہمیوں کو دور کردینے کے لیے کافی ہیں۔ مگر یاددہانی کے طور پر میں پھر اس بات کا اعادہ کرتا ہوں اور مسلمان اور غیر مسلم دونوں کو اچھی طرح اس سے واقف ہوجانا چاہیے کہ اسلامی حکومت کے معنی مسلمانوں کی حاکمیت (Sovereignty) کے نہیں ہیں۔ مسلمانوں کی حاکمیت اسی طرح اور اسی قدر ناجائز اور خلافِ حق و انصاف ہے جس قدر غیر مسلموں کی حاکمیت۔ اسلام سرے سے انسانی حاکمیت ہی کا مخالف ہے۔ اس کا مدعا تو اللہ کی حاکمیت قائم کرنا ہے اور اس اصل الاصول کے خلاف جہاں جو حکومت بھی ہو وہ اسکو غلط کہتا ہے خواہ وہ کسی مسلمان بادشاہ یا رئیس کی حکومت ہو یا غیر مسلم راجہ اور قیصر کی، اور خواہ وہ کسی مسلمان قوم کی حکومت ہو یا غیر مسلم قوم کی۔ درحقیقت اسلامی حکومت نام ہے ان اصول و قوانین کی حکومت کا جو حق تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی فلاح و ترقی کے لیے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعے سے انسان کو تعلیم کیے ہیں۔ اور اسلامی حکومت کی جانب دعوت دینے کا مطلب انہی اصول و قوانین کی جانب دعوت دینا ہوتا ہے نہ کہ مسلمانوں کی غلامی اور ماتحتی کی جانب۔ ہم غیر مسلموں کو اپنے ماتحت لانا نہیں چاہتے نہ ہم اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں بلکہ ہم تو چند اصول و قوانین کی تبلیغ کرتے ہیں اور انکے مطابق اپنی اور

دوسروں کی زندگی کو ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ اصول اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے ہیں یا اسلیے دوسرے الفاظ میں ہم دنیا کے ہر انسان کو دوسرے انسانوں کی اور خود اسکے اپنے نفس کی غلامی سے آزادی دلاکر اللہ تعالیٰ کی حکومت میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہم میں اور غیر مسلموں میں جو فرق نظر آتا ہے وہ اسلیے ہے کہ ہم داعی ہیں اور وہ مدعو۔ لیکن جب وہ ان اصولوں کو قبول کرکے ان پر عمل پیرا ہو جائینگے تو ہم اور وہ مساوی ہو جائینگے، بلکہ ممکن ہے کہ انفرادی حیثیت سے موجودہ دور کے نسلی مسلمان سے وہ اشخاص اور جماعتیں ترقی و عروج میں بازی لیجائیں جو اسلام کے اصول و قوانین کو بعد میں قبول کریں۔ ان اصول و قوانین کے منافع کسی نسل و وطن، قوم و قبیلہ کے ساتھ مقید و محدود نہیں ہیں۔ دنیا کی ہر قوم و ہر نسل کے اشخاص اس سے یکساں طور پر منتفع ہو سکتے ہیں۔ جس طرح ان سے عبداللہ و عبدالرحمٰن ترقی و فلاح حاصل کر سکتے ہیں اسی طرح ان پر عمل کرکے گاندھی و جواہر لال بھی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

پھر ہماری یہ دعوت کسی تعصب، کسی عناد، کسی مجادلہ و مقابلہ کے لیے نہیں ہے بلکہ محض بنی نوع انسان کی فلاح اور بلندی و ترقی کے لیے ہے۔ دشمنی کے بجائے انکی ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ اس دعوت کا محرک ہے۔ اور اسکی بنیاد محض جذبات پر قائم نہیں ہے بلکہ قوی و مستحکم عقلی و فطری دلائل پر قائم ہے جو ہر صحیح الفطرت اور سلیم العقل انسان کو اپیل کر سکتے ہیں۔

جالندھر میں ہماری ایجنسی

جالندھر میں رسالہ ترجمان القرآن اور تالیفاتِ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ایجنسی قائم کردی گئی ہے ضرورت مند حضرات ذیل کے پتہ سے ہمارا شائع کردہ لٹریچر حاصل کر سکتے ہیں۔

پبلک بک ڈپو۔ رینک بازار۔ جالندھر

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

الٰہ، رب، دین اور عبادت، یہ چار لفظ قرآن کی اصطلاحی زبان میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ قرآن کی ساری دعوت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اکیلا رب اور الٰہ ہے، اسکے سوا نہ کوئی الٰہ ہے نہ رب، اور نہ الوہیت و ربوبیت میں کوئی اس کا شریک ہے۔ لہٰذا اُسی کو اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرو اور اسکے سوا ہر ایک کی الٰہیت و ربوبیت سے انکار کردو، اسکی عبادت اختیار کرو اور اسکے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اسکے لیے اپنے دین کو خالص کرلو اور ہر دوسرے دین کو رد کردو۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ (انبیاء - ۲)

ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کی طرف یہی وحی کی ہے کہ "میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے لہٰذا میری عبادت کرو۔"

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (التوبہ - ۵)

اور انکو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اسکے کہ ایک ہی الٰہ کی عبادت کریں۔ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور وہ پاک ہے اُس شرک سے جو وہ کرتے ہیں۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ (انبیاء - ٦)

یقیناً تمہارا (یعنی تمام انبیاء کا) یہ گروہ ایک ہی گروہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں لہٰذا میری عبادت کرو۔

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ (انعام - ۲۰)

کہو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (الکہف - ۱۲)	تو جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی اور کی عبادت شریک نہ کرے۔
وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل - ۵)	ہم نے ہر قوم میں ایک رسول اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے پرہیز کرو۔
اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (آل عمران - ۹)	تو کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں سب چار و ناچار اسی کی مطیع ہیں اور اسی کی طرف انہیں پلٹ کر جانا ہے۔
قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (الزمر - ۲)	اے نبی کہو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت کروں اپنے دین کو اسکے لیے خالص کرتے ہوئے۔
اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (آل عمران - ۵)	اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تم سب کا رب بھی، لہٰذا اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

یہ چند آیات محض نمونہ کے طور پر ہیں، ورنہ جو شخص قرآن کو پڑھے گا وہ اول نظر میں محسوس کرلیگا کہ قرآن کا سارا بیان انہی چار اصطلاحوں کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس کتاب کا مرکزی خیال (Central Idea) یہی ہے کہ اللہ رب اور الٰہ ہے اور ربوبیت و الٰہیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہے، لہٰذا عبادت اسی کی ہونی چاہیے اور دین خالصۃً اسی کے لیے ہونا چاہیے۔

اصطلاحات اربعہ کی اہمیت | اب یہ ظاہر بات ہے کہ قرآن کی تعلیم کو سمجھنے کے لیے ان چاروں اصطلاحوں کا صحیح اور مکمل مفہوم سمجھنا بالکل ناگزیر ہے۔ اگر کوئی شخص نہ جانتا ہو کہ الٰہ اور رب کا مطلب کیا ہے، عبادت کی کیا تعریف ہے، اور دین کسے کہتے ہیں، تو در اصل اسکے لیے

پورا قرآن بے معنی ہو جائیگا۔ وہ توحید کو جان سکیگا، نہ شرک کو سمجھ سکیگا، نہ عبادت کو اللہ کیلیے مخصوص کر سکیگا، نہ دین ہی کو اللہ کے لیے خالص کر سکیگا۔ اسی طرح اگر کسی کے ذہن میں ان اصطلاحوں کا مفہوم غیر واضح اور نامکمل ہو تو اسکے لیے قرآن کی پوری تعلیم غیر واضح ہو گی اور قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود اسکا عقیدہ اور عمل دونوں نامکمل رہ جائینگے۔ وہ لا الٰہ الا اللہ کہتا رہیگا اور اسکے باوجود بہتوں کو الٰہ بناتا رہیگا۔ وہ اللہ کے سوا کسی کے رب ہونے کا اعلان کرتا رہیگا اور اسکے باوجود بہت سے ارباب من دون اللہ اس کے رب بنے رہینگے۔ وہ پوری نیک نیتی کے ساتھ کہے گا کہ میں اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتا، اور پھر بھی بہت سے معبودوں کی عبادت میں مشغول رہیگا۔ وہ پورے زور کے ساتھ کہیگا کہ میں اللہ کے دین میں ہوں، اور اگر کسی دوسرے دین کی طرف اسے منسوب کیا جائے تو لڑنے پر آمادہ ہو جائیگا، مگر اسکے باوجود بہت سے دینوں کا قلاوہ اسکی گردن میں پڑا رہیگا۔ اسکی زبان سے کسی غیر اللہ کے لیے "الٰہ" اور "رب" کے الفاظ تو کبھی نہ نکلینگے، مگر یہ الفاظ جن معانی کے لیے وضع کیے گئے ہیں اُنکے لحاظ سے اسکے بہت سے الٰہ اور ارباب ہونگے اور اس بے چارے کو خبر تک نہ ہو گی کہ میں نے واقعی اللہ کے سوا دوسرے ارباب والٰہ بنا رکھے ہیں۔ اسکے سامنے اگر آپ کہدیں کہ تو دوسروں کی "عبادت" کر رہا ہے اور "دین" میں شرک کا مرتکب ہو رہا ہے تو وہ پتھر مارنے اور منہ نوچنے کے لیے دوڑیگا مگر عبادت اور دین کی جو حقیقت ہے اسکے لحاظ سے واقعی وہ دوسروں کا عابد اور دوسروں کے دین میں داخل ہو گا اور نہ جانے گا کہ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ حقیقت میں دوسروں کی عبادت ہے، اور یہ حالت جس میں مبتلا ہوں یہ حقیقت میں غیر اللہ کا دین ہے۔

غلط فہمی کا اصل سبب عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا تھا اُس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ الٰہ کے کیا معنی ہیں اور رب کسے کہتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں لفظ انکی بول چال میں پہلے سے مستعمل تھے۔

انہیں معلوم تھا کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے۔ اسلیے جب ان سے کہا گیا کہ اللہ ہی اکیلا الٰہ اور رب ہے اور الوہیت و ربوبیت میں کسی کا قطعاً کوئی حصہ نہیں، تو وہ پوری بات کو پا گئے۔ انہیں بلا کسی التباس و اشتباہ کے معلوم ہو گیا کہ دوسروں کے لیے کس چیز کی نفی کی جا رہی ہے اور اللہ کے لیے کس چیز کو خاص کیا جا رہا ہے۔ جنہوں نے مخالفت کی یہ جان کر کی کہ غیر اللہ کی الوہیت و ربوبیت کے انکار سے کہاں کہاں ضرب پڑتی ہے، اور جو ایمان لائے وہ یہ سمجھ کر ایمان لائے کہ اس عقیدہ کو قبول کر کے ہمیں کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہوگا۔ اسی طرح عبادت اور دین کے الفاظ بھی ان کی بولی میں پہلے سے رائج تھے، انکو معلوم تھا کہ عبد کسے کہتے ہیں، عبودیت کس حالت کا نام ہے، عبادت سے کونسا رویہ مراد ہے، اور دین کا کیا مفہوم ہے، اسلیے جب ان سے کہا گیا کہ سب کی عبادت چھوڑ کر صرف اللہ کی عبادت کرو، اور ہر دین سے الگ ہو کر اللہ کے دین میں داخل ہو، تو انہیں قرآن کی دعوت کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش نہ آئی۔ وہ سنتے ہی سمجھ گئے کہ یہ تعلیم ہماری زندگی کے نظام میں کس نوعیت کے تغیر کی طالب ہے۔

لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے، بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لیے خاص ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائیٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے اُن کے لیے الٰہ اور رب اور دین اور عبادت کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائیٹی میں رائج تھے۔ انہی دونوں وجوہ سے دورِ اخیر کی کتب لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے ان معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے

مسلمان سمجھتے تھے۔ مثلاً لفظ الٰہ کو قریب قریب بتوں اور دیوتاؤں کا ہم معنی بنا دیا گیا، رب کو پالنے پوسنے والے یا پروردگار کا مترادف ٹھیرایا گیا، عبادت کے معنی پوجا اور پرستش کے لیے گئے، دین کو دھرم اور مذہب اور (Religion) کے مقابلہ کا لفظ قرار دیا گیا، طاغوت کا ترجمہ بت یا شیطان کیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اصل مدعا ہی سمجھنا لوگوں کے لیے مشکل ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو الٰہ نہ بناؤ، لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بتوں اور دیوتاؤں کو چھوڑ دیا ہے لہٰذا قرآن کا منشا پورا کر دیا، حالانکہ الٰہ کا مفہوم اور جن چیزوں پر عائد ہوتا ہے ان سب کو وہ اچھی طرح پکڑے ہوئے ہیں اور انہیں خبر نہیں کہ یہ ہم غیر اللہ کو الٰہ بنا رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو رب تسلیم نہ کرو، لوگ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ کے سوا کسی کو پروردگار نہیں مانتے لہٰذا ہماری توحید مکمل ہو گئی، حالانکہ رب کا اطلاق اور جن مفہومات پر ہوتا ہے ان کے لحاظ سے اکثر لوگوں نے خدا کے بجائے دوسروں کی ربوبیت تسلیم کر رکھی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ طاغوت کی عبادت چھوڑ دو اور صرف اللہ کی عبادت کرو، لوگ کہتے ہیں کہ ہم بتوں کو نہیں پوجتے، شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں، اور صرف اللہ کو سجدہ کرتے ہیں، لہٰذا ہم نے قرآن کی یہ بات بھی پوری کر دی، حالانکہ پتھر کے بتوں کے سوا دوسرے طاغوتوں سے وہ چمٹے ہوئے ہیں اور پرستش کے سوا دوسری قسم کی تمام عبادتیں انہوں نے اللہ کے بجائے غیر اللہ کے لیے خاص کر رکھی ہیں۔ یہی حال دین کا ہے کہ اللہ کے لیے دین کو خالص کرنے کا مطلب صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی "مذہب اسلام" قبول کرے اور ہندو یا عیسائی یا یہودی نہ رہے، اس بنا پر ہر وہ شخص جو "مذہب اسلام" میں ہے یہ سمجھ رہا ہے کہ میں نے اللہ کے لیے دین کو خالص کر رکھا ہے، حالانکہ دین کے وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کا دین اللہ کے لیے خالص نہیں ہے۔

غلط فہمی کے نتائج | پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم، بلکہ اسکی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی ہے اور اسلام قبول کرنے کے باوجود لوگوں کے عقائد و اعمال میں جو نقائص نظر آ رہے ہیں ان کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی مرکزی تعلیم اور اسکے حقیقی مدعا کو واضح کرنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان اصطلاحوں کی پوری پوری تشریح کی جائے۔

اگرچہ میں اس سے پہلے اپنے متعدد مضامین میں ان کے مفہوم پر روشنی ڈالنے کی کوشش کر چکا ہوں، لیکن جو کچھ اب تک میں نے بیان کیا ہے وہ نہ تو بجائے خود تمام غلط فہمیوں کو صاف کرنے کے لیے کافی ہے، اور نہ اس سے لوگوں کو پوری طرح اطمینان حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ لغت اور آیات قرآنی سے استشہاد کے بغیر لوگ میری ہر تشریح کو میری ذاتی رائے سمجھتے ہیں، اور میری رائے کم از کم ان لوگوں کے لیے تو اطمینان کی موجب نہیں ہو سکتی جو مجھ سے اختلاف رائے رکھتے ہوں۔ اس مضمون میں میں کوشش کرونگا کہ ان چاروں اصطلاحوں کا مکمل مفہوم واضح کروں، اور کوئی ایسی بات بیان نہ کروں جس کا ثبوت لغت اور قرآن سے نہ ملتا ہو۔

ترتیب کے لحاظ سے ہم سب سے پہلے لفظ الٰہ کو لینگے۔ پھر رب، پھر عبادت، پھر دین۔

الٰہ

لغوی تحقیق | اس لفظ کا مادہ ا ل ہ ہے اس مادہ سے جو الفاظ لغت میں آئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

اَلِہَ اذا تحیّر، یعنی حیران و سرگشتہ ہوا۔

الہت الیٰ فلانٍ ای سکنت الیہ، یعنی اس کی پناہ میں جا کر یا اس سے تعلق پیدا کر کے میں نے سکون و اطمینان حاصل کیا۔

اله الرجل یأله اذا فزع من امر نزل به فآلهه غیرہ ای اجارہ۔ یعنی آدمی کسی مصیبت یا تکلیف کے نزول سے خوف زدہ ہوا اور دوسرے نے اسکو پناہ دی۔

اله الرجل الی الرجل اتجه الیه لشدة شوقه الیه۔ آدمی نے دوسرے کی طرف شدت شوق کی وجہ سے توجہ کی۔

اله الفصیل اذا ولع بامہ۔ اونٹنی کا بچہ جو اس سے بچھڑ گیا تھا ماں کو پاتے ہی اس سے چمٹ گیا۔

لاہ یلیہ لیہا و لاھا اذا احتجب۔ یعنی پوشیدہ و مستور ہوا۔ نیز ارتفع یعنی بلند ہوا۔

اله الٰهَةً و اُلُوهَةً و الوهیةً عَبَدَ۔ یعنی عبادت کی۔

ان تمام معانی مصدریہ پر غور کرنے سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اَلَهَ یَاْلَهُ اِلٰهَةً کے معنی عبادت (پرستش) اور الٰہ کے معنی معبود کس مناسبت سے پیدا ہوئے :

انسان کے ذہن میں عبادت کیلیے اولین تحریک اپنی حاجتمندی سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کسی کی عبادت کا خیال تک نہیں کرسکتا جب تک اسے یہ گمان نہ ہو کہ وہ میری حاجتیں پوری کرسکتا ہے، خطرات اور مصائب میں مجھے پناہ دسکتا ہے، اضطراب کی حالت میں مجھے سکون بخش سکتا ہے۔

پھر یہ بات کہ آدمی کسی کو حاجت روا سمجھے اس تصور کے ساتھ لازم و ملزوم کا تعلق رکھتی ہے کہ وہ اسے اپنے سے بالاتر سمجھے اور نہ صرف مرتبہ کے اعتبار سے اسکی برتری تسلیم کرے بلکہ طاقت اور زور کے اعتبار سے بھی اسکی بالادستی کا قائل ہو۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سلسلۂ اسباب و علل کے تحت جن چیزوں سے بالعموم انسان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور جنکی حاجت روائی کا سارا عمل انسان کی آنکھوں کے سامنے یا اسکے حدود علم کے اندر واقع ہوتا ہے انکے متعلق پرستش کا کوئی جذبہ اس میں پیدا نہیں ہوتا مثلاً مجھے خرچ کیلیے روپے کی ضرورت ہوتی ہے، میں جاکر ایک شخص سے نوکری یا مزدوری کی درخواست کرتا ہوں، وہ میری درخواست کو قبول کرکے مجھے کوئی کام دیتا ہے اور اس کام کا معاوضہ مجھے دیتا ہے۔ یہ سارا عمل چونکہ میرے حواس اور علم کے دائرے کے اندر پیش آیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس نے میری یہ حاجت کس طرح پوری کی ہے، اسلیے میرے ذہن میں اسکے لائق پرستش ہونے کا وہم تک نہیں گذرتا۔ پرستش کا تصور میرے ذہن میں صرف

اسی حالت میں پیدا ہو سکتا ہے جبکہ کسی کی شخصیت یا اسکی طاقت یا اسکی حاجت روائی و اثر اندازی کی کیفیت پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہو۔ اسی لیے معبود کے معنی میں وہ لفظ اختیار کیا گیا جسکے اندر رفعت کے ساتھ پوشیدگی اور حیرانی و سرگشتگی کا مفہوم بھی شامل ہے۔ پھر جسکے متعلق بھی انسان یہ گمان رکھتا ہو کہ وہ احتیاج کی حالت میں حاجت روائی کر سکتا ہے، خطرات میں پناہ دے سکتا ہے، اضطراب میں سکون بخش سکتا ہے، اسکی طرف انسان کا اشتیاق کے ساتھ توجہ کرنا ایک امر ناگزیر ہے۔

پس معلوم ہوا کہ معبود کیلیے الٰہ کا لفظ جن تصورات کی بنا پر بولا گیا وہ یہ ہیں: حاجت روائی۔ پناہ دہندگی۔ سکون بخشی۔ بالاتری و بالادستی۔ ان اختیارات اور ان طاقتوں کا مالک ہونا جن کی وجہ سے یہ توقع کی جا سکے کہ معبود قاضی الحاجات اور پناہ دہندہ ہو سکتا ہے۔ اسکی شخصیت کا پراسرار ہونا یا منظرِ عام پر نہ ہونا۔ انسان کا اسکی طرف مشتاق ہونا۔

اہلِ جاہلیت کا تصورِ الٰہ اس لغوی تحقیق کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیے کہ الوہیت کے متعلق اہلِ عرب اور امم قدیمہ کے وہ کیا تصورات تھے جنکی تردید قرآن کرنا چاہتا ہے:

(۱) وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا (مریم - ۵)
اور انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کیلیے ذریعۂ قوت ہوں (یا انکی حمایت میں آکر وہ محفوظ رہیں)

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُونَ (یٰس - ۵)
اور انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنا لیے ہیں اس امید پر کہ انکی مدد کی جائیگی (یعنی وہ الٰہ انکی مدد کرینگے)

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جاہلیت جنکو الٰہ کہتے تھے انکے متعلق وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ انکے پشتیبان ہیں، مشکلات اور مصائب میں انکی حفاظت کرتے ہیں، اور انکی حمایت میں وہ خوف اور نقصان سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

(۲) فَمَا اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (ہود - ۹)
پھر جب تیرے رب کے فیصلہ کا وقت آگیا تو انکے وہ الٰہ جنہیں وہ اللہ کے بجائے پکارا کرتے تھے، انکے کچھ بھی کام نہ آسکے اور وہ انکے لیے تباہی و ہلاکت کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ کا سبب نہ بنے۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ اَمْوَاتٌ
اور اللہ کے بجائے جنکو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کے بھی خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں، مردہ

غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَّمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ،	ہیں نہ کہ زندہ، اور انہیں یہ بھی خبر نہیں ہے کہ انہیں کب
اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (النحل - ۳)	دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا جائیگا۔ تمہارا الٰہ تو ایک ہی الٰہ ہے۔
لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ،	اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو نہ پکار، اس کے
لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (قصص - ۹)	سوا کوئی الٰہ نہیں۔
وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ	جو لوگ اللہ کے بجائے دوسرے شریکوں کو پکارتے
دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا	ہیں وہ محض وہم پر چلتے ہیں اور نری اٹکلیں
الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (یونس - ۷)	دوڑاتے ہیں۔

ان آیات سے چند امور پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک یہ کہ اہلِ جاہلیت جنکو الٰہ کہتے تھے انہیں مشکل کشائی و حاجت روائی کے لیے پکارتے یا بالفاظِ دیگر ان سے دعا مانگتے تھے دوسرے یہ کہ انکے یہ الٰہ صرف جن یا فرشتے یا دیوتا ہی نہ تھے بلکہ وفات یافتہ انسان بھی تھے، جیسا کہ اموات غیر احیاء وما یشعرون ایان یبعثون سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان الٰہوں کے متعلق وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ انکی دعاؤں کو سنتے ہیں اور انکی مدد کو پہنچنے پر قادر ہیں۔

یہاں دعا کے مفہوم اور اُس امداد کی نوعیت کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے جسکی الٰہ سے توقع کی جاتی ہے۔ اگر مجھے پیاس لگتی ہے اور میں اپنے خادم کو پانی لانے کے لیے پکارتا ہوں یا اگر میں بیمار ہوتا ہوں اور علاج کے لیے ڈاکٹر کو بلاتا ہوں تو اس پر نہ دعا کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ اسکے معنی خادم یا ڈاکٹر کو الٰہ بنانے کے ہیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ سلسلۂ اسباب کے تحت ہے نہ کہ اس سے مافوق۔ لیکن اگر میں پیاس کی حالت میں یا بیماری میں خادم یا ڈاکٹر کو پکارنے کے بجائے کسی ولی یا کسی دیوتا کو پکارتا ہوں تو یہ ضرور اسکو الٰہ بنانا اور اس سے دعا مانگنا ہے، کیونکہ جو ولی صاحب

مجھ سے سینکڑوں میل دور کسی قبر میں آرام فرما رہے ہیں، انکو پکارنے کے معنی یہ ہیں کہ میں ان کو سمیع و بصیر سمجھتا ہوں اور یہ خیال رکھتا ہوں کہ عالم اسباب پر انکی فرمانروائی قائم ہے جسکی وجہ سے وہ مجھ تک پانی پہنچانے یا میری بیماری دور کر دینے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ایسی حالت میں کسی دیوتا کو پکارنے کے معنی یہ ہیں کہ پانی یا صحت و مرض پر اسکی حکومت ہے اور وہ فوق الطبیعی طور پر میری حاجت پوری کرنے کے لیے اسباب کو حرکت دے سکتا ہے۔ پس الٰہ کا وہ تصور جسکی بنا پر اس سے دعا مانگی جاتی ہے لامحالہ ایک فوق الطبیعی اقتدار اور اس کے ساتھ ہی فوق الطبیعی قوتوں کے مالک ہونے کا تصور ہے۔

(۳) وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِنَ الْقُرَىٰ وَصَرَّفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ، فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً، بَلْ ضَلُّوا عَنْهُمْ وَذَٰلِكَ إِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ (احقاف - ۴)

تمہارے اردگرد جن بستیوں کے آثار ہیں انکو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ انہیں ہم نے بار بار بدل بدل کر اپنی نشانیاں دکھائی تھیں تاکہ وہ رجوع کریں۔ تو جنکو انہوں نے تقرب کا ذریعہ سمجھ کر اللہ کے سوا اپنا الٰہ بنایا تھا انہوں نے نزول عذاب کے وقت کیوں نہ انکی مدد کی؟ مدد تو درکنار وہ تو انہیں چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ یہ تھی حقیقت ان کے جھوٹ اور ان کی من گھڑت باتوں کی۔

وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ءَأَتَّخِذُ مِنْ دُونِهِ آلِهَةً إِنْ يُرِدْنِ الرَّحْمَٰنُ بِضُرٍّ لَا تُغْنِ عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَلَا يُنْقِذُونِ (یٰس - ۲)

کیوں نہ میں اس کی عبادت کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے؟ کیا اس کے سوا میں ان کو الٰہ بناؤں جن کا حال یہ ہے کہ اگر رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو انکی سفارش میرے کچھ کام نہیں آسکتی اور وہ مجھے چھڑا نہیں سکتے؟

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ	اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے حامی یا کارساز
اَوْلِيَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ	ٹھیرا رکھے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو انکی عبادت اس لیے
اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ	کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں، اللہ ان کے
فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (الزمر - ۱)	درمیان اُس معاملہ کا فیصلہ (قیامت کے روز) کریگا جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔
وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	وہ اللہ کے سوا انکی عبادت کرتے ہیں جو نہ انکو ضرر
مَا لَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ وَ	پہنچانے پر قادر ہیں نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے
يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس - ۲)	ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

ان آیات سے چند مزید باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جاہلیت اپنے الہوں کے متعلق یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ساری خدائی انہی کے درمیان تقسیم ہو گئی ہے اور انکے اوپر کوئی خداوند اعلیٰ نہیں ہے۔ وہ واضح طور پر ایک خداوند اعلیٰ کا تصور رکھتے تھے جس کے لیے ان کی زبان میں اللہ کا لفظ تھا، اور دوسرے الہوں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس خداوند اعلیٰ کی خدائی میں ان الہوں کا کچھ دخل اور اثر ہے، انکی بات مانی جاتی ہے، ان کے ذریعہ سے ہمارے کام بن سکتے ہیں، انکی سفارش سے ہم نفع حاصل کر سکتے ہیں اور نقصانات سے بچ سکتے ہیں۔ انہی خیالات کی بنا پر وہ اللہ کے ساتھ اُن کو بھی الٰہ قرار دیتے تھے۔ لہٰذا اُنکی اصطلاح کے لحاظ سے جسکے متعلق بھی یہ خیالات رکھے جائیں وہ الٰہ ہے، یا بالفاظ دیگر کسی کے متعلق یہ خیالات رکھنا اُسے الٰہ بنانا ہے۔

(۴) وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـهَيْنِ	اللہ فرماتا ہے کہ دو الٰہ نہ بناؤ،
اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ	الٰہ تو ایک ہی ہے۔ لہٰذا تم مجھی سے
فَارْهَبُوْنِ (النحل - ۷)	ڈرو۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کی ناراضی سے خوف کیا جائے اور جس کے متعلق یہ گمان کیا جائے کہ اگر ہم اسکی توجہ اور عنایت سے محروم ہو گئے تو نقصان اٹھائینگے، وہ الٰہ ہے دوسرے الفاظ میں الٰہ کے تصور میں اسکے لائق خوف و حذر ہونے کا تصور بھی شامل ہے۔

(۵) اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (التوبہ۔۵)

انہوں نے اپنے علماء اور راھبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی رب ٹھہرا یا حالانکہ انہیں صرف ایک الٰہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (الفرقان۔۴)

بھلا کیا خیال ہے اس شخص کے متعلق جس نے اپنی خواہش نفس کو الٰہ بنا لیا ہے؟ کیا تو اسکی ذمہ داری لے سکتا ہے؟

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَاۗؤُهُمْ (انعام۔۱۶)

اس طرح بہت سے مشرکوں کے لیے انکے ٹھہرائے ہوئے شریکوں (یعنی شرکاء فی الالوہیت) نے اپنی اولاد کو قتل کرنے کا فعل خوشنما بنا دیا۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰۗؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (الشوریٰ۔۳)

یا وہ ایسے شرکاء (یعنی شرکاء فی الالوہیت) رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لیے از قسم دین ایسی شریعت مقرر کی ہے جس کی اجازت اللہ نے نہیں دی؟

ان آیات میں الٰہ کا ایک اور مفہوم ملتا ہے جو پہلے مفہومات سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں فوق الطبیعی اقتدار کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جسکو الٰہ بنایا گیا ہے وہ یا تو کوئی انسان ہے یا انسان کا اپنا نفس ہے۔ اور الٰہ اسکو اس معنی میں نہیں بنایا گیا ہے کہ اس سے دعا مانگی جاتی ہو یا اسے نفع و نقصان کا مالک سمجھا جاتا ہو اور اسکی پناہ ڈھونڈی جاتی ہو، بلکہ وہ الٰہ اس معنی میں بنایا گیا ہے کہ اس کے حکم کو قانون تسلیم کیا گیا، اسکے امر و نہی کی اطاعت کی گئی، اسکے حلال کو حلال اور اسکے حرام کو

حرام مان لیا گیا، اور یہ خیال کر لیا گیا کہ اس کو بجائے خود حکم دینے اور منع کرنے کا اختیار حاصل ہے کوئی اور اقتدار اس سے بالاتر نہیں ہے جس کی سند لینے اور جس سے رجوع کرنے کی ضرورت ہو پہلی آیت میں علماء اور راھبوں کو الٰہ بنانے کا ذکر ہے۔ اس کی واضح تشریح ہم کو حدیث میں ملتی ہے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے جب اس آیت کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ جس چیز کو تمہارے علماء اور راھبوں نے حلال کیا اسے تم لوگ حلال مان لیتے تھے اور جسے انہوں نے حرام قرار دیا اسے تم حرام تسلیم کر لیتے تھے اور اس بات کی کچھ پروا نہ کرتے تھے کہ اللہ کا اس بارے میں کیا حکم ہے۔ رہی دوسری آیت تو اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ جو شخص اپنی خواہش نفس کی اطاعت کرتا ہو اور اسی کے حکم کو بالاتر رکھتا ہو وہ دراصل اپنے نفس ہی کو اپنا الٰہ بنائے ہوئے ہے۔ اسکے بعد والی دونوں آیتوں میں اگرچہ الٰہ کے بجائے شریک کا لفظ آیا ہے، مگر جیسا کہ ہم نے ترجمہ میں واضح کیا ہے شریک سے مراد الٰہیت میں شریک ٹھہرانا ہے، اور یہ دونوں آیتیں صاف فیصلہ کرتی ہیں کہ جو لوگ اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے مقرر کیے ہوئے رواج یا ضابطہ یا طریقہ کو جائز قانون سمجھتے ہیں وہ اُس قانون ساز کو الٰہیت میں خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

الوہیت کے باب میں ملاکِ امر الٰہ کے یہ جتنے مفہومات اوپر بیان ہوئے ہیں ان سب کے درمیان ایک منطقی ربط ہے۔ جو شخص فوق الطبیعی معنی میں کسی کو اپنا حامی و مددگار، مشکل کشا اور حاجت روا، دعاؤں کا سننے والا اور نفع یا نقصان پہنچانے والا سمجھتا ہے، اسکے ایسا سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ اسکے نزدیک وہ ہستی نظام کائنات میں کسی نہ کسی نوعیت کا اقتدار رکھتی ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی سے تقویٰ اور خوف کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اسکی ناراضی میرے لیے نقصان کی اور رضامندی میرے لیے فائدے کی موجب ہے اُسکے اس اعتقاد اور اس عمل کی وجہ بھی

اسکے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے ذہن میں اس ہستی کے متعلق ایک طرح کے اقتدار کا تصور رکھتا ہے پھر جو شخص خداوند اعلیٰ کو ماننے کے باوجود اسکے سوا دوسروں کی طرف اپنی حاجات کے لیے رجوع کرتا ہے اسکے اس فعل کی علت بھی صرف یہی ہے کہ خداوندی کے اقتدار میں وہ انکو کسی نہ کسی طرح کا حصہ دار سمجھ رہا ہے۔ اور علیٰ ہذا القیاس وہ شخص جو کسی کے حکم کو قانون اور کسی کے امر و نہی کو اپنے لیے واجب الاطاعت قرار دیتا ہے وہ بھی اس کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کرتا ہے۔ پس الوہیت کی اصل روح اقتدار ہے، خواہ وہ اقتدار اس معنی میں سمجھا جائے کہ نظام کائنات پر اس کی فرمانروائی فوق الطبیعی نوعیت کی ہے، یا وہ اس معنی میں تسلیم کیا جائے کہ دنیوی زندگی میں انسان اسکے تحت امر ہے اور اس کا حکم بذاتِ خود واجب الاطاعت ہے۔

قرآن کا استدلال یہی اقتدار کا تصور ہے جسکی بنیاد پر قرآن اپنا سارا زور غیر اللہ کی الٰہیت کے انکار اور صرف اللہ کی الٰہیت کے اثبات پر صرف کرتا ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ زمین اور آسمان میں صرف ایک ہی ہستی تمام اختیارات و اقتدارات کی مالک ہے، خلق اسی کی ہے، نعمت اسی کی ہے، امر اسی کا ہے، قوت اور زور بالکل اسکے ہاتھ میں ہے، ہر چیز چار و ناچار اسی کی اطاعت کر رہی ہے، اسکے سوا نہ کسی کے پاس کوئی اقتدار ہے، نہ کسی کا حکم چلتا ہے، نہ کوئی خلق اور تدبیر اور انتظام کے رازوں سے واقف ہے، اور نہ کوئی اختیارات حکومت میں ذرہ برابر شریک و حصہ دار ہے، لہٰذا اسکے سوا حقیقت میں کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اور جب حقیقت میں کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے تو تمہارا ہر وہ فعل جو تم دوسروں کو الٰہ سمجھتے ہوئے کرتے ہو اصلاً غلط ہے خواہ وہ دعا مانگنے یا پناہ ڈھونڈنے کا فعل ہو، یا خوف و رجا کا فعل ہو، یا سفارشی بنانے کا فعل ہو، یا حکم ماننے اور اطاعت کرنے کا فعل ہو۔ یہ تمام تعلقات جو تم نے دوسروں سے قائم کر رکھے ہیں صرف اللہ کے لیے مخصوص ہونے چاہئیں کیونکہ وہی اکیلا صاحب اقتدار ہے۔

اس باب میں قرآن جس طریقہ سے استدلال کرتا ہے وہ اسی کی زبان سے سنیے:

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ (الزخرف - ۷)

وہی ہے جو آسمان میں بھی اکیلا الٰہ ہے اور زمین میں بھی وہی الٰہ ہے، اور وہی حکیم اور علیم ہے (یعنی آسمان و زمین میں حکومت کرنے کے لیے جس علم اور حکمت کی ضرورت ہے وہ اسی کے پاس ہے)

أَفَمَن يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ... وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ... إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (النحل ۲-۳)

تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو پیدا نہیں کرتا دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تمہاری سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی؟ ..... خدا کو چھوڑ کر یہ جن دوسروں کو پکارتے ہیں وہ تو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں.... تمہارا الٰہ تو ایک ہی الٰہ ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ۚ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ (فاطر - ۱)

لوگو! تم پر اللہ کا جو احسان ہے اس کا دھیان کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا خالق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، پھر تم کدھر بھٹکائے جا رہے ہو؟

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَىٰ قُلُوبِكُم مَّنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِهِ (انعام - ۵)

کہو تم نے کبھی سوچا کہ اگر اللہ تمہاری سننے اور دیکھنے کی قوتیں سلب کرلے اور تمہارے دلوں پر مہر کردے (یعنی عقل چھین لے) تو اللہ کے سوا اور کونسا الٰہ ہے جو یہ چیزیں تمہیں لا دیگا؟

وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُ

وہی اللہ ہے کہ اسکے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ اُسی کے لیے تعریف ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی

الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ - قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِضِيَاءٍ أَفَلَا تَسْمَعُونَ - قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (قصص - ۷)

وہی اکیلا صاحبِ حکم و اقتدار ہے - اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔ کہو تم نے کبھی غور کیا کہ اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو اسکے سوا کونسا دوسرا الٰہ ہے جو تمہیں روشنی لا دیگا؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ کہو تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اگر اللہ تمہارے اوپر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اس کے سوا اور کونسا الٰہ ہے جو تمہیں رات لا دیگا کہ اس میں تم سکون حاصل کرو؟ کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ - وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ (السبا - ۳)

کہو کہ اللہ کے سوا جن کو تم نے الٰہ سمجھ رکھا ہے انہیں پکار دیکھو، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کسی چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں، نہ آسمان و زمین کے انتظام میں ان کی کوئی شرکت ہے، نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے، اور نہ اللہ کے ہاں کوئی سفارش کام آتی ہے بجز اُس کے جس کے حق میں اللہ خود ہی سفارش کی اجازت دے۔

خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى .....

اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر چڑھا کر لاتا ہے اس نے سورج اور چاند کو تابع کر رکھا ہے اور ہر ایک اپنی مدت مقررہ تک چل رہا ہے ......

....خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ
ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ
مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ،
يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا
مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ،
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (الزمر-۱)

... اس نے ایک نفس سے تمہاری پیدائش کی ابتدا کی (یعنی نسل انسانی کا آغاز کیا) پھر اسی نفس سے اس کا جوڑا بنایا اور تمہارے لیے مویشیوں کے آٹھ جوڑے اتارے۔ وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ میں اس طرح پیدا کرتا ہے کہ تین پردوں[1] کے اندر تمہاری تخلیق کے یکے بعد دیگرے کئی مدارج طے ہوتے ہیں۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے، "اقتدار" حکومت اسی کا ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، پھر تم کدھر پھیرے جا رہے ہو؟

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا
بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ
اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ، ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ،
بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ - اَمَّنْ جَعَلَ
الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا
وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ
حَاجِزًا ، ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ، بَلْ اَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ - اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ
اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ
خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ، ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ، قَلِيْلًا

کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر وہ خوش منظر باغ اگائے جنکے درخت اگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں شریک ہے؟ مگر یہ لوگ حقیقت سے منہ موڑتے ہیں۔ پھر وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس میں دریا جاری کیے اور اس کے لیے پہاڑوں کو لنگر بنایا اور دو سمندروں کے درمیان پردہ حائل کیا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ مگر اکثر مشرکین بے علم ہیں۔ پھر وہ کون ہے جو اضطرار کی حالت میں آدمی کی دعا

[1] تین پردوں سے مراد پیٹ، رحم اور مشیمہ ہے

اَمَّا تُشْرِكُونَ۔ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ	سُنتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے؟ اور وہ کون
ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ	ہے جو تم کو زمین میں خلیفہ بناتا ہے (یعنی تصرف کے
الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ	اختیارات دیتا ہے)؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور
مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔	الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ مگر تم کم ہی
اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ	دھیان کرتے ہو۔ پھر وہ کون ہے جو تم کو خشکی اور تری
وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ	کے اندھیاروں میں راستہ دکھاتا ہے اور کون اپنی
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ، قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ	رحمت (یعنی بارش) سے پہلے خوشخبری لانے والی
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (النمل ـ ۵)	ہوائیں بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان

کاموں میں بھی شریک ہے؟ اللہ بالاتر ہے ان کے اُس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔ پھر وہ کون ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا اور اسکا اعادہ کرتا ہے، اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ کہو اگر تم اپنے شرک میں سچے ہو تو اس پر دلیل[1] لاؤ۔

اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ	وہ جو آسمانوں اور زمین کی حکومت کا مالک ہے
وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ	اور جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے اور اقتدار حکومت
يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ	میں جسکا کوئی شریک نہیں ہے اور جس نے ہر چیز کو پیدا
كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا وَاتَّخَذُوْا	کیا اور ہر چیز کے لیے پورا پورا اندازہ مقرر کیا ہے،
مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا	لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے الٰہ بنا لیے ہیں جو کسی چیز کو
وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ	پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں، جو خود اپنے

[1] یعنی اگر تم مانتے ہو کہ یہ سب کام اللہ ہی کے ہیں اور ان کاموں میں کوئی اسکا شریک نہیں ہے تو آخر کس دلیل سے تم الٰہیت میں اسکے ساتھ دوسروں کو شریک بناتے ہو؟ جنکے پاس اقتدار نہیں اور زمین و آسمان میں جنکا کوئی خود مختارانہ کام نہیں وہ الٰہ کیسے ہو گئے؟

لِأَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ
مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (الفرقان-۱)

ذات کے لیے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے اور جنک
موت اور زندگی اور دوبارہ پیدائش پر کسی قسم کا اقتد
حاصل نہیں ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى
يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَّ
خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ
كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
وَّكِيْلٌ (انعام-۱۳)

آسمان و زمین کو عدم سے وجود میں لانے وا
اسکا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اسکی کوئی بیو
نہیں ہے، اس نے تو ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہ
چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب، کوئی آ
سوا اللہ نہیں ہے، ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا تم اسی کی ع
کرو اور وہی ہر چیز کی حفاظت و خبر گیری کا کفیل ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَلَوْ يَرَى
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ
اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (بقرہ-۲۰)

بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں ک
خدائی میں اسکا شریک و مماثل قرار دیتے ہیں اور ا
کی طرح انکو بھی محبوب رکھتے ہیں، حالانکہ جو ایما
لانے والے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے
ہیں۔ کاش یہ ظالم اس حقیقت کو جسے نزول عذ
کے وقت محسوس کرینگے آج ہی محسوس کر لیتے کہ قوت ساری کی ساری اللہ ہی کے پاس ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ
اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ
اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ
لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (احقاف-۱)

کہو تم نے اپنے ان معبودوں کی حالت پر کبھی غور بھی ک
جنہیں تم خدا کے بجائے حاجت روائی کے لیے پکارتے ہو
مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین کا کتنا حصہ ان کا بنایا ہو
اور آسمانوں کی پیدائش میں انکی کس قدر شرکت ہے؟
..... اس سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر

کسی ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتا۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ، لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ (انبیاء - ۲)

اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور بھی الٰہ ہوتے تو نظام عالم درہم برہم ہوجاتا۔ پس اللہ جو عرش (یعنی کائنات کے تخت سلطنت) کا مالک ہے اُن تمام باتوں سے پاک ہے جو یہ اسکی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ اپنے کسی فعل کے لیے جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں۔

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (المومنون - ۵)

اللہ نے نہ کوئی بیٹا بنایا اور نہ اسکے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر الٰہ اپنی پیدا کی ہوئی چیز کو لے کر اٹھتا اور ہر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا۔

قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا، سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا (بنی اسرائیل - ۵)

اے نبی کہو کہ اگر اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ ہوتے جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے، تو وہ مالک عرش کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے ضرور تدبیریں تلاش کرتے۔ پاک ہے وہ اور بہت بالاتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

ان تمام آیات میں اول سے آخر تک ایک ہی مرکزی خیال پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ الٰہیت اور اقتدار لازم و ملزوم ہیں، اور اپنی روح و معنی کے اعتبار سے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ جو اقتدار نہیں رکھتا وہ الٰہ نہیں ہوسکتا اور اسے الٰہ نہ ہونا چاہیے، اور جو اقتدار رکھتا ہے وہی الٰہ ہوسکتا ہے اور اسی کو الٰہ ہونا چاہیے، کیونکہ الٰہ سے تمہاری جس قدر ضروریات متعلق ہیں، یا جن ضروریات کی خاطر تمہیں کسی کو الٰہ ماننے کی حاجت پیش آتی ہے، ان میں سے کوئی ضرورت بھی اقتدار کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی، لہٰذا غیر مقتدر کا الٰہ ہونا بے معنی ہے،

حقیقت کے خلاف ہے، اور اسکی طرف رجوع کرنا لاحاصل ہے۔

اس مرکزی خیال کو لے کر قرآن جس طریقہ سے استدلال کرتا ہے اسکے مقدمات اور نتائج حسب ذیل ترتیب کے ساتھ اچھی طرح سمجھ میں آسکتے ہیں:

(۱) حاجت روائی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی، امداد و اعانت، خبرگیری و حفاظت، اور استجابت دعوات جنکو تم نے معمولی کام سمجھ رکھا ہے، دراصل یہ معمولی کام نہیں ہیں بلکہ انکا سررشتہ پورے نظام کائنات کی تخلیقی اور انتظامی قوتوں سے جا ملتا ہے۔ تمہاری ذرا ذرا سی ضرورتیں جس طرح پوری ہوتی ہیں اس پر غور کرو تو تم کو معلوم ہو کہ زمین و آسمان کے عظیم الشان کارخانہ میں بیشمار اسباب کی مجموعی حرکت کے بغیر ان کا پورا ہونا محال ہے۔ پانی کا ایک گلاس جو تم پیتے ہو، اور گیہوں کا ایک دانہ جو تم کھاتے ہو، اسکو مہیا کرنے کے لیے سورج اور زمین اور ہواؤں اور سمندروں کو خدا جانے کتنا کام کرنا پڑتا ہے تب کہیں یہ چیزیں تم کو بہم پہنچتی ہیں۔ پس تمہاری دعائیں سننے اور تمہاری حاجتیں رفع کرنے کے لیے کوئی معمولی اقتدار نہیں بلکہ وہ اقتدار درکار ہے جو زمین و آسمان کو پیدا کرنے کے لیے، سیاروں کو حرکت دینے کے لیے، ہواؤں کو گردش دینے اور بارش برسانے کے لیے، غرض پوری کائنات کا انتظام کرنے کے لیے درکار ہے۔

(۲) یہ اقتدار ناقابل تقسیم ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خلق کا اقتدار کسی کے پاس ہو، اور رزق کا کسی اور کے پاس، سورج کسی کے قبضہ میں ہو اور زمین کسی اور کے قبضہ میں، پیدا کرنا کسی کے اختیار میں ہو، بیماری و صحت کسی اور کے اختیار میں، اور موت اور زندگی کسی تیسرے کے اختیار میں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ نظام کائنات کبھی چل ہی نہ سکتا۔ لہٰذا تمام اقتدار و اختیارات کا ایک ہی مرکزی فرمانروا کے قبضہ میں ہونا ضروری ہے، کائنات کا انتظام چاہتا ہے کہ ایسا ہو، اور فی الواقع ایسا ہی ہے۔

(۳) جب تمام اقتدار ایک ہی فرمانروا کے ہاتھ میں ہے اور اقتدار میں کسی کا ذرہ برابر کوئی حصہ نہیں ہے تو لا محالہ الوہیت بھی بالکلیہ اُسی فرمانروا کے لیے خاص ہے اور اس میں بھی کوئی حصہ دار نہیں ہے۔ کسی میں یہ طاقت نہیں کہ تمہاری فریاد رسی کر سکے، دعائیں قبول کر سکے، پناہ دے سکے، حامی و ناصر اور ولی و کارساز بن سکے، نفع یا نقصان پہنچا سکے۔ لہٰذا الٰہ کا جو مفہوم بھی تمہارے ذہن میں ہے اسکے لحاظ سے کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کوئی اس معنی میں بھی الٰہ نہیں کہ فرمانروائے کائنات کے ہاں مقرب بارگاہ ہونے کی حیثیت ہی سے اس کا کچھ زور چلتا ہو اور اسکی سفارش مانی جاتی ہو۔ اُسکے انتظام سلطنت میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، کوئی اسکے معاملات میں دخل نہیں دے سکتا، اور سفارش قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل اسی کے اختیار میں ہے، کوئی زور کسی کے پاس نہیں ہے کہ اُسکے بل پر وہ اپنی سفارش قبول کرا سکے۔

(۴) اقتدار اعلیٰ کی واحدانیت کا اقتضا یہ ہے کہ حاکمیت و فرمانروائی کی جتنی قسمیں ہیں سب ایک ہی مقتدر اعلیٰ کی ذات میں مرکوز ہوں اور حاکمیت کا کوئی جزء بھی کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ ہو۔ جب خالق وہ ہے اور خلق میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، جب رازق وہ ہے اور رزق رسانی میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، جب پورے نظام کائنات کا مدبر و منتظم وہ ہے اور تدبیر و انتظام میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، تو یقیناً حاکم اور آمر اور شارع بھی اسی کو ہونا چاہیے اور اقتدار کی اس شق میں بھی کسی کے شریک ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جس طرح اسکی سلطنت کے دائرے میں اُسکے سوا کسی دوسرے کا فریاد رس اور حاجت روا اور پناہ دہندہ ہونا غلط ہے اُسی طرح کسی دوسرے کا مستقل بالذات حاکم اور خود مختار فرمانروا اور آزاد قانون ساز ہونا بھی غلط ہے۔ تخلیق اور رزق رسانی، احیاء اور اماتت، تسخیر شمس و قمر اور تکویر لیل و نہار، قضا اور قدر، حکم اور بادشاہی، امر اور تشریع سب ایک ہی کلی اقتدار و حاکمیت کے مختلف پہلو

ہیں اور یہ اقتدار و حاکمیت ناقابل تقسیم ہے - اگر کوئی شخص اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے حکم کو واجب الاطاعت سمجھتا ہے تو وہ ویسا ہی شرک کرتا ہے جیسا ایک غیر اللہ سے دعا مانگنے والا شرک کرتا ہے - اور اگر کوئی شخص سیاسی معنی میں مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ اور حاکم علی الاطلاق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، تو اسکا یہ دعویٰ بالکل اسی طرح خدائی کا دعویٰ ہے جس طرح فوق الطبعی معنی میں کسی کا یہ کہنا کہ میں تمہارا ولی و کارساز اور مددگار و محافظ ہوں - اسی لیے جہاں خلق اور تقدیر اشیاء اور تدبیر کائنات میں اللہ کے لاشریک ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہیں لہٗ الحکم اور لہٗ الملک اور لم یکن لہ شریک فی الملک بھی کہا گیا ہے جو اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ الوہیت کے مفہوم میں پادشاہی و حکمرانی کا مفہوم بھی شامل ہے اور توحید الٰہ کے لیے لازم ہے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے بھی اللہ کے ساتھ کسی کی شرکت نہ تسلیم کی جائے۔ اس کو اور زیادہ کھول کر حسب ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ	کہو یا اللہ تو جو ملک کا مالک ہے، تجھے اختیار ہے
تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ	جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے
مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ	چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جس کو چاہے
مَنْ تَشَاءُ (آل عمران - ۳)	ذلیل کر دے -
فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ، لَآ اِلٰهَ	پس بالا و برتر ہے اللہ جو حقیقی پادشاہ ہے، اسکے
اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ (المومنون - ۶)	سوا کوئی الٰہ نہیں وہ عرش بزرگ کا مالک ہے -
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ	کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب سے،
النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ (الناس)	انسانوں کے پادشاہ سے، انسانوں کے الٰہ سے

اور اس سے زیادہ تصریح سورۂ مومن میں ہے جہاں فرمایا:

یَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْهُمْ شَیْءٌ، لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (رکوع ۲)

یعنی جس روز سب لوگ بے نقاب ہونگے، کسی کا کوئی راز اللہ سے چھپا نہ ہوگا اس وقت پکارا جائیگا کہ آج بادشاہی کس کی ہے؟ اور جواب اسکے سوا کچھ نہ ہوگا کہ اس اکیلے اللہ کی جس کا اقتدار سب پر غالب ہے۔ اس آیت کی بہترین تفسیر وہ حدیث ہے جو امام احمد نے حضرت عبداللہ ابن عمر سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا انہ تعالیٰ یطوی السمٰوات والارض بیدہ ثم یقول انا الملک انا الجبار انا المتکبر، این ملوک الارض؟ این الجبارون؟ این المتکبرون؟ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو اپنی مٹھی میں لیکر پکاریگا میں ہوں بادشاہ، میں ہوں جبار، میں ہوں متکبر، کہاں ہیں وہ جو زمین میں بادشاہ بنتے تھے؟ کہاں ہیں جبار؟ کہاں ہیں متکبر؟۔ عبداللہ ابن عمر فرماتے ہیں کہ جس وقت حضور خطبہ میں یہ الفاظ فرما رہے تھے اس وقت آپ پر ایسا لرزہ طاری تھا کہ ہم ڈر رہے تھے کہ کہیں آپ منبر سے گر نہ پڑیں۔

(باقی)

لکھنؤ میں ہماری ایجنسی

لکھنؤ میں ہم نے اپنی ایجنسی قائم کر دی ہے جہاں سے رسالہ ترجمان القرآن اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تالیفات ہر وقت مل سکتی ہیں۔ ضرورت مند حضرات ذیل کے پتہ سے دریافت فرمائیں۔

احترام اینڈ سنز۔ جنرل مرچنٹس۔ امین آباد لکھنؤ

معراج کی رات

[یہ وہ تقریر ہے جو ۲۰ اگست کو نشرگاہ لاہور سے نشر کی گئی تھی اور آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے یہاں نقل کی جاتی ہے]

عام روایت کے مطابق آج کی رات معراج کی رات ہے۔ یہ معراج کا واقعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سب سے زیادہ مشہور واقعات میں سے ہے۔ لیکن یہ جس قدر مشہور ہے اسی قدر افسانوں کی تہیں اس پر چڑھ گئی ہیں۔ عام لوگ عجوبہ پسند ہوتے ہیں۔ انکی عجائب پسندی کے جذبہ کو بس اپنی تسکین کا سامان چاہیے۔ اسیلیے معراج کی اصل روح اور اسکی غرض اور اسکے فائدوں اور نتیجوں کو تو انہوں نے نظر انداز کر دیا اور ساری گفتگو اس پر ہونے لگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جسم کے ساتھ آسمان پر گئے تھے یا صرف روح گئی تھی، براق کیا تھا، جنت اور دوزخ کا حال آپ نے کیا دیکھا اور فرشتے کس شکل کے تھے۔ حالانکہ دراصل یہ واقعہ تاریخ انسانی کے ان بڑے واقعات میں سے ہے جنہوں نے زمانہ کی رفتار کو بدلا اور تاریخ پر اپنا مستقل اثر چھوڑا ہے۔ اور اسکی حقیقی اہمیت کیفیت معراج میں نہیں بلکہ مقصد اور نتیجہ معراج میں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ کرۂ زمین جس پر ہم آپ رہتے ہیں خدا کی عظیم الشان سلطنت کا ایک چھوٹا سا صوبہ ہے۔ اس صوبہ میں خدا کی طرف سے جو پیغمبر بھیجے گئے ہیں انکی حیثیت کچھ اس طرح کی سمجھ لیجیے جیسے دنیا کی حکومتیں اپنے ماتحت ملکوں میں گورنر یا وائسرائے بھیجا کرتی

ہیں۔ ایک لحاظ سے دونوں میں بڑا بھاری فرق ہے۔ دنیوی حکومتوں کے گورنر اور وائسرائے محض انتظام ملکی کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں۔ اور سلطان کائنات کے گورنر اور وائسرائے اس لیے مقرر ہوتے ہیں کہ انسان کو صحیح تہذیب، پاکیزہ اخلاق، اور سچے علم وعمل کے وہ اصول بتائیں جو روشنی کے مینارے کی طرح انسانی زندگی کی شاہراہ پر کھڑے ہوئے صدیوں تک سب کو راستہ دکھاتے رہیں۔ مگر اس فرق کے باوجود دونوں میں ایک طرح کی مشابہت بھی ہے۔ دنیا کی حکومتیں گورنری جیسے ذمہ داری کے منصب انہی لوگوں کو دیتی ہیں جو انکے سب سے زیادہ قابل اعتماد آدمی ہوتے ہیں، اور جب وہ انہیں اس عہدے پر مقرر کر دیتی ہیں تو پھر انہیں یہ دیکھنے اور سمجھنے کا پورا موقع دیتی ہیں کہ حکومت کا اندرونی نظام کس طرح کس پالیسی پر چل رہا ہے، اور ان کے سامنے اپنے وہ راز بے نقاب کر دیتی ہیں جو عام رعایا پر ظاہر نہیں کیے جاتے۔ ایسا ہی حال خدا کی سلطنت کا بھی ہے۔ وہاں بھی پیغمبری جیسے ذمہ داری کے منصب پر وہی لوگ مقرر ہوتے ہیں جو سب سے زیادہ قابل اعتماد تھے، اور جب انہیں اس منصب پر مقرر کر دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے خود انکو اپنی سلطنت کے اندرونی نظام کا مشاہدہ کرایا اور ان پر کائنات کے وہ اسرار ظاہر کیے جو عام انسانوں پر ظاہر نہیں کیے جاتے۔

مثال کے طور پر حضرت ابراہیم کو آسمان اور زمین کے ملکوت، یعنی اندرونی انتظام کا مشاہدہ کرایا گیا[1] اور یہ بھی آنکھوں سے دکھا دیا گیا کہ خدا کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے[2]۔ حضرت موسیٰ کو طور پر جلوۂ ربانی دکھایا گیا اور ایک خاص بندے کے ساتھ کچھ مدت تک پھرایا گیا تاکہ اللہ کی مشیت کے تحت دنیا کا انتظام جس طرح ہوتا ہے اسکو دیکھیں اور سمجھیں[3]۔ ایسے ہی کچھ تجربات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] وکذالک نری ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض (انعام - ۸)

[2] واذ قال ابراھیم رب ارنی کیف تحی الموتیٰ (بقرہ - ۳۵)

[3] فوجدا عبداً من عبادنا اتینٰہ رحمۃ من عندنا وعلمنٰہ من لدنا علما (کہف ۹ - ۱۰)

کے بھی سکھنے۔ کبھی آپ خدا کے مقرب فرشتے کو افق پر علانیہ دیکھتے ہیں[1]، کبھی وہ فرشتہ آپ سے قریب ہوتے ہوتے اس قدر قریب آجاتا ہے کہ آپ کے اور اسکے درمیان دو کمانوں کے بقدر بلکہ اس سے بھی کچھ کم فاصلہ رہ جاتا ہے۔ کبھی وہی فرشتہ آپکو سدرۃ المنتہیٰ، یعنی عالم مادی کی آخری سرحد پر ملتا ہے اور وہاں آپ خدا کی عظیم الشان نشانیاں دیکھتے ہیں[2]۔

اسی نوعیت کے تجربات میں سے ایک وہ چیز ہے جس کو معراج کہتے ہیں۔ معراج صرف سیر اور مشاہدہ ہی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایسے موقع پر ہوتی ہے جبکہ پیغمبر کو کسی کار خاص پر مقرر کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے اور اہم ہدایات دی جاتی ہیں۔ وہ حضرت موسیٰ کی معراج ہی تھی جبکہ انکو وادی سینا میں بلاکر احکام عشرہ (Ten Commandments) دیے گئے اور انکو حکم دیا گیا کہ مصر جاکر فرعون کو منشاء خداوندی کے مطابق نظام حکومت میں اصلاح کرنے کی دعوت دو۔ اسی طرح وہ حضرت عیسیٰ کی معراج تھی جب انھوں نے ساری رات پہاڑ پر گذاری اور پھر اٹھکر بارہ رسول مقرر کیے اور وہ وعظ کہا جو پہاڑی کے وعظ کے نام سے مشہور ہے۔ ایسا ہی ایک اہم موقع وہ تھا جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو طلب کیا گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب آپ کو اپنے مشن کی تبلیغ کرتے ہوئے تقریباً بارہ سال گذر چکے تھے حجاز کے اکثر قبائل میں، اور قریب کے ملک حبش میں آپ کی آواز پہنچ چکی تھی، اور آپکی تحریک ایک مرحلہ سے گذر کر دوسرے مرحلہ میں قدم رکھنے کو تھی۔ دوسرے مرحلہ سے میری مراد یہ ہے کہ اب وقت آگیا تھا کہ آپ مکہ کی ناموافق سرزمین کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف منتقل ہو جائیں جہاں آپ کی کامیابی کے لیے زمین تیار تھی۔ اس دوسرے مرحلہ میں آپکا مشن بہت پھیلنے والا تھا۔ صرف حجاز اور صرف عرب ہی

[1] ولقد راٰہ بالافق المبین (التکویر)

[2] وھو بالافق الاعلیٰ ..... الی قولہ لقد راٰی من آیٰت ربہ الکبریٰ (النجم - ۱)

نہیں بلکہ گرد و پیش کی دوسری قوموں سے بھی سابقہ پیش آنا تھا، اور اسلام کی تحریک ایک اسٹیٹ میں تبدیل ہونے کو تھی، اسلیے اس اہم موقع پر آپ کو ایک نیا پروانۂ تقرر اور نئی ہدایات دینے کے لیے بادشاہ کائنات نے اپنے حضور میں طلب فرمایا۔

اسی پیشی و حضوری کا نام معراج ہے۔ عالم بالا کا یہ حیرت انگیز سفر ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے پیش آیا تھا۔ اس سفر کے ضمنی واقعات احادیث میں آئے ہیں، مثلاً بیت المقدس پہنچ کر نماز ادا کرنا، آسمان کے مختلف طبقات سے گذرنا، پچھلے زمانہ کے پیغمبروں سے ملنا اور پھر آخری منزل پر پہنچنا۔ لیکن قرآن ضمنی چیزوں کو چھوڑ کر ہمیشہ اصل مقصد تک اپنے بیان کو محدود رکھتا ہے اس لیے اس نے کیفیت معراج کا کچھ ذکر نہیں کیا بلکہ وہ چیز تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے جس کے لیے آنحضرت کو بلایا گیا تھا۔ قرآن کی سترھویں سورت میں آپکو یہ تفصیل مل سکتی ہے۔ اسکے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ میں مکہ کے لوگوں کو آخری نوٹس دیا گیا کہ اگر تمہاری سختیوں کی وجہ سے خدا کا پیغمبر جلاوطنی پر مجبور ہوا تو مکہ میں تم کو چند سال سے زیادہ رہنے کا موقع نہ مل سکے گا[1]۔ اور بنی اسرائیل کو، جن سے عنقریب مدینہ میں پیغمبر سے براہ راست سابقہ پیش آنا تھا، خبردار کیا گیا کہ تم اپنی تاریخ میں دو زبردست ٹھوکریں کھا چکے ہو اور دو قیمتی موقعے کھو چکے ہو، اب تم کو تیسرا موقع ملنے والا ہے اور یہ آخری موقع ہے[2]۔

دوسرے حصہ میں وہ بنیادی اصول بتائے گئے جن پر انسانی تمدن و اخلاق کی تعمیر ہونی چاہیے۔ یہ ۱۴ اصول ہیں[3]:

---

[1] وان کادوا لیستفزونك من الارض لیخرجوك منها واذًا لا یلبثون خلٰفك الا قلیلا (بنی اسرائیل ۸)

[2] وقضینا الیٰ بنی اسرائیل . . . . الیٰ قوله عسیٰ ربکم ان یرحمکم (بنی اسرائیل - ۱)

[3] سورۂ بنی اسرائیل، رکوع ۳-۴

(۱) صرف اللہ کی بندگی کی جائے اور اقتدار اعلیٰ میں اسکے ساتھ کسی کی شرکت نہ تسلیم کیجائے

(۲) تمدن میں خاندان کی اہمیت ملحوظ رکھی جائے، اولاد والدین کی فرمانبردار و خدمت گذار ہو اور رشتہ دار ایک دوسرے کے ہمدرد و مددگار ہوں۔

(۳) سوسائٹی میں جو لوگ غریب یا معذور ہوں یا اپنے وطن سے باہر مدد کے محتاج ہوں وہ بے وسیلہ نہ چھوڑ دیئے جائیں۔

(۴) دولت کو فضول ضائع نہ کیا جائے جو مالدار اپنے روپے کو برے طریقہ سے خرچ کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔

(۵) لوگ اپنے خرچ کو اعتدال پر رکھیں، نہ بخل کرکے دولت کو روکیں اور نہ فضول خرچی کرکے اپنے لیے اور دوسرے کے لیے مشکلات پیدا کریں۔

(۶) رزق کی تقسیم کا قدرتی انتظام جو خدا نے کیا ہے انسان اُس میں اپنے مصنوعی طریقوں سے خلل نہ ڈالے، خدا اپنے انتظام کی مصلحتوں کو زیادہ بہتر جانتا ہے۔

(۷) معاشی مشکلات کے خوف سے لوگ اپنی نسل کی افزائش نہ روکیں۔ جس طرح موجودہ نسلوں کے رزق کا انتظام خدا نے کیا ہے آنے والی نسلوں کے لیے بھی وہی انتظام کریگا۔

(۸) خواہشِ نفس کو پورا کرنے کے لیے زنا کا راستہ برا راستہ ہے لہذا نہ صرف زنا سے پرہیز کیا جائے بلکہ اسکے قریب جانے والے اسباب کا دروازہ بھی بند ہونا چاہیے۔

(۹) انسانی جان کی حرمت خدا نے قائم کی ہے لہذا خدا کے مقرر کردہ قانون کے سوا کسی دوسری بنیاد پر آدمی کا خون نہ بہایا جائے، نہ کوئی اپنی جان دے، نہ دوسرے کی جان لے۔

(۱۰) یتیموں کے مال کی حفاظت کی جائے، جب تک وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوں ان کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

(۱۱) عہد و پیمان کو پورا کیا جائے، انسان اپنے معاہدات کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

(۱۲) تجارتی معاملات میں ناپ تول ٹھیک ٹھیک راستی پر ہونی چاہیے، اوزان اور پیمانے صحیح رکھے جائیں۔

(۱۳) جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کی پیروی نہ کرو، وہم اور گمان پر نہ چلو، کیونکہ آدمی کو اپنی تمام قوتوں کے متعلق خدا کے سامنے جوابدہی کرنی ہے کہ اس نے انہیں کس طرح استعمال کیا۔

(۱۴) نخوت اور تکبر کے ساتھ نہ چلو، غرور کی چال سے نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ پہاڑوں سے اونچے ہو سکتے ہو۔

یہ ۱۴ اصول جو معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے تھے، انکی حیثیت صرف اخلاقی تعلیمات ہی کی نہ تھی، بلکہ یہ وہ پروگرام تھا جس پر آپ کو آئندہ سوسائیٹی کی تعمیر کرنی تھی۔ یہ ہدایات اُس وقت دی گئی تھیں جب آپکی تحریک عنقریب تبلیغ کے مرحلہ سے گذر کر حکومت اور سیاسی اقتدار کے مرحلے میں قدم رکھنے والی تھی، لہذا یہ گویا ایک مینی فسٹو تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ خدا کا پیغمبر ان اصولوں پر تمدن کا نظام قائم کریگا۔ اسی لیے معراج میں یہ ۱۴ نکات مقرر کرنے کے ساتھ ہی اللہ تعالی نے تمام پیروانِ اسلام کے لیے پانچ وقت کی نماز فرض[۱] کی تاکہ جو لوگ اس پروگرام کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے اٹھیں ان میں اخلاقی انضباط پیدا ہو اور وہ خدا سے غافل نہ ہونے پائیں، ہر روز پانچ مرتبہ انکے ذہن میں یہ بات تازہ ہوتی رہے کہ وہ خود مختار نہیں ہیں بلکہ ان کا حاکم اعلی خدا ہے جسکو انہیں اپنے کام کا حساب دینا ہے۔

---

[۱] اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشھودا (بنی اسرائیل - ۹)

(بقیہ مضمون صـ۱۴۱)

تو دراصل وہ خدا کے مقابلہ میں بغاوت کرتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس جو شخص اس شعبۂ زندگی میں کسی دوسرے کی حاکمیت و آمریت تسلیم کرتا ہے وہ بھی بغاوت ہی کا ارتکاب کرتا ہے۔ مومن کا کام اس بغاوت کو دنیا سے مٹانا اور خدا کی زمین پر خدا کے سوا ہر ایک کی خداوندی ختم کر دینا ہے۔ مومن کی زندگی کا مشن یہ ہے کہ جس طرح خدا کا قانونِ تکوینی تمام کائنات میں نافذ ہے اسی طرح خدا کا قانون شرعی بھی عالم انسانی میں نافذ ہو۔ مومن کی تمام مساعی کا ہدف مقصود یہ ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو خدا کے سوا ہر ایک کی بندگی سے نکالے اور صرف خدا کا بندہ بنائے یہ کام فی الاصل تو نصیحت، فہمائش، ترغیب اور تبلیغ ہی سے کرنے کا ہے۔ لیکن جو لوگ ملک خدا کے ناجائز مالک بن بیٹھے ہیں اور خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنا لیتے ہیں وہ عموماً اپنی خداوندی سے محض نصیحتوں کی بنا پر دست بردار نہیں ہو جایا کرتے، اور نہ وہ اس کو گوارا کرتے ہیں کہ عامۃ الناس میں حقیقت کا علم پھیلے کیونکہ اس سے ان کو خطرہ ہوتا ہے کہ ان کی خداوندی خود بخود ختم ہو جائے گی، اس لئے مومن کو مجبوراً جنگ کرنی پڑتی ہے تاکہ حکومت الٰہیہ کے قیام میں جو چیز سد راہ ہو اسے راستہ سے ہٹا دے۔

نظام جماعت

۳۔ ہر وہ شخص (خواہ وہ عورت ہو یا مرد اور خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، اور خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ کا باشندہ ہو) جو عقیدۂ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ سمجھ کر شہادت دے کہ یہی اس کا عقیدہ ہے، وہ جماعت اسلامی کا رکن ہو سکتا ہے۔ اس شہادت کے سوا اس جماعت میں داخل ہونے کے لئے کوئی شرط نہیں ہے

تشریح:۔ اس جماعت میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہوگا۔ اسی طرح کوئی شخص کلمۂ طیبہ کے الفاظ کو بے سمجھے بوجھے محض زبان سے ادا کر کے بھی اس جماعت میں نہیں آ سکتا۔ اس دائرے

میں آنے کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمہ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو وہ جانتا ہو کہ اس کلمہ میں نفی کس چیز کی ہے اور اثبات کس چیز کا، اور اس نفی و اثبات کی شہادت دینے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں، اور یہ شہادت اس کے طرز خیال و طرز زندگی میں کس قسم کے تغیر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہنے کی جرأت کرے صرف وہی جماعت اسلامی میں داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ پیدائشی غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے، یا پیدائشی مسلمان ہو اور از سر نو ایمان لائے۔

۴۔ ادائے شہادت کے بعد جو تغیرات لازماً ایک شخص کو اپنی زندگی میں کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں:-

(الف) فرائض کو ان کی شرعی پابندیوں کے ساتھ ادا کرے،

(ب) کبائر سے اجتناب کرے اور اگر نادانستہ کسی کبیرہ کا مرتکب ہو جائے تو اس سے توبہ کرے،

(ج) اگر وہ کوئی ایسا ذریعہ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کی تعریف میں آتا ہے مثلاً سود، شراب، زنا، رقص و سرود، شہادت زور، رشوت، خیانت، قمار، قتال فی غیر سبیل اللہ وغیرہ، تو اس کو ترک کر دے بلا اس لحاظ کے کہ اس کے ترک کرنے میں کتنا ہی نقصان ہو، اور اگر اس کی معاش میں ان وسائل کا کوئی حصہ ہو تو وہ اس حصہ سے اپنی معیشت کو پاک کرے،

(د) اگر اس کے قبضہ میں ایسا مال (یا جائداد) ہو جو حرام طریقہ سے آیا ہو، یا جس میں حقداروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دست بردار ہو جائے اور اہل حقوق کو ان کے حق پہنچا دے،

(ہ) اگر وہ کسی ایسی حکومت کا صدر، یا رئیس، یا گورنر، یا وزیر یا جج ہے جو زمین کے کسی حصہ پر حاکمیت (SOVEREIGNTY) کی مدعی ہو تو اپنے اس منصب سے دست بردار ہو جائے،

(و) اگر وہ کسی مجلس قانون ساز کا رکن ہو تو اس سے مستعفی ہو جائے کیونکہ قانون سازی صرف خدا کا منصب ہے اور انسان کا قانون ساز بننا خدائی کے دعوے کو متضمن ہے،

(س) اگر وہ کسی غیر الٰہی نظام کی طرف سے خطاب رکھتا ہو تو اس کو واپس کرے اور اُن وفاداریوں اور نیاز مندیوں سے باز آئے جن کی بدولت اس نے خطاب پایا تھا یا جن کو اب خطاب یافتہ ہونے کی وجہ سے نباہنا پڑتا ہے۔

یہ تغیرات جس شخص کی زندگی میں فوراً رونما نہ ہوں اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ کلمۂ شہادت ادا کرنے میں صادق نہ تھا اور اس بنا پر وہ جماعت میں نہ لیا جائے گا۔ یا لیا جا چکا ہو تو خارج کیا جائے گا۔

۵۔ ادائے شہادت کے بعد بتدریج جو تغیرات ہر شخص کو اپنی زندگی میں کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں:۔

(الف) دین کا کم از کم اتنا علم حاصل کر لینا کہ اسلام اور جاہلیت (غیر اسلام) کا فرق معلوم ہو اور حدود اللہ سے واقفیت حاصل ہو جائے،

(ب) تمام معاملات میں اپنے نقطۂ نظر، طرزِ خیال، اور عمل کو ہدایت الٰہی کے مطابق ڈھالنا، اپنی زندگی کے مقصد، اپنی پسند اور قدر کے معیار، اور اپنی وفاداریوں کے محور کو تبدیل کر کے رضائے الٰہی کے موافق بنانا، اور اپنی خودسری و نفس پرستی کے بت کو توڑ کر تابع امرِ رب بن جانا،

(ج) اُن تمام رسوم جاہلیت سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف ہوں، اور اپنے ظاہر و باطن کو احکام شریعت کے مطابق بنانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا،

(د) تمام اُن تعصبات اور دلچسپیوں سے اپنے قلب کو، اور ان مشاغل اور جھگڑوں اور بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جن کی بنا نفسانیت یا دنیا پرستی پر ہو اور جن کی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو،

(ہ) فاسقین و فجار اور خدا سے غافل لوگوں سے ربط و تعلق توڑنا اور صالحین سے ربط قائم کرنا،

(و) ان تمام اداروں سے تعلق منقطع کرنا جو جاہلیت کی خدمت کرتے ہوں اور جن کا مقصد حاکمیت رب العالمین کے قیام و اثبات کے سوا کچھ اور ہو۔ (ایسے اداروں کے ساتھ وقتی ضروریات کے لحاظ سے تعاون یا صلح و موادعت کے معاملات کیے جا سکتے ہیں، مگر یہ افراد کا کام نہیں بلکہ جماعت کا کام ہے کوئی مسلمان انفرادی طور پر ایسے کسی ادارے کا جز نہیں بن سکتا)

(مہ) اپنے معاملات کو راستی، عدل، خدا ترسی، اور بے لاگ حق پرستی پر قائم کرنا،

(ح) اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو قیام حکومت الٰہیہ کے نصب العین پر مرتکز کر دینا اور اپنی ضروریات زندگی کے سوا اُن تمام معروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں،

ضروری نہیں کہ یہ تغیرات تمام اشخاص میں کمال درجہ پر ہوں، مگر ہر شخص کو اس باب میں اپنی تکمیل کی کوشش کرنی ہوگی کیونکہ انہی تغیرات کے اعتبار سے ناقص یا کامل ہونے پر جماعت اسلامی میں آدمی کے مرتبے کا تعین ہوگا۔

۶۔ جو لوگ غیر الٰہی نظام حکومت کو چلانے میں آلہ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں یا غیر الٰہی قانون کے اجراء میں مددگار بنتے ہیں اُن کی تین حیثیتیں ہیں:۔

اگر وہ اپنے اس کام پر خوش اور مطمئن ہیں اور اپنے اس کسب کو حلال و طیب سمجھتے ہیں اور اسی راہ میں ترقی درجات کے متمنی ہیں تو ان کے لئے اس دائرے میں کوئی جگہ نہیں۔

اگر وہ اس نظام کو غلط اور اپنے کسب کو حرام سمجھتے ہیں، مگر اعتراف گناہ کے باوجود اس کو محض ضعف ایمان کیوجہ سے ترک نہیں کر سکتے، تو وہ جماعت اسلامی کے طبقہ سوم میں (جس کی تشریح آگے آتی ہے) داخل ہو سکتے ہیں۔

اگر وہ محض اس مجبوری سے اس نظام میں منسلک ہیں کہ دُوسرا ذریعہ زندگی نہیں پاتے، اور نیک نیتی کے ساتھ اس بات کے لئے تیار ہوں کہ دُوسرا ذریعہ پاتے ہی اسے ترک کر دیں گے، تو وہ جماعت اسلامی کے درجہ دوم میں (جس کی تشریح آگے آتی ہے) داخل ہو سکتے ہیں+

تشریح:۔ یہ واضح رہے کہ غیر الٰہی نظام اطاعت کے ایک جزء اور دوسرے جزء میں کوئی فرق نہیں اس کے جو اجزاء بظاہر بالکل معصوم نظر آتے ہیں وہ بھی اسی قدر ناپاک ہیں جس قدر دوسرے غیر معصوم اجزاء

نیز جو غیر الٰہی نظام اطاعت مسلمانوں کی خداوندی میں چل رہا ہے وہ بھی اپنے تمام اجزاء سمیت اسی حکم میں ہے۔ مسلمانوں کی خداوندی اس کو ہرگز کوئی سند طہارت عطا نہیں کرتی۔

۷۔ جہاں ایک شخص متذکرہ صدر طریقہ پر ایمان لائے یا رکھتا ہو اس کے لئے لازم ہے کہ ایک طرف اپنے حلقہ تعارف میں دوسرے مردوں اور عورتوں کو دعوت ایمان دے، اور دوسری طرف اپنی بستی میں ان لوگوں کو تلاش کرے جو اس کی طرح ایمان لائے ہوں۔ پھر جہاں ایسے دو آدمی بھی مل جائیں وہاں وہ عارضی طور پر جماعتی ہیئت بنالیں اور مرکز کو اطلاع دے کر اس سے ہدایت حاصل کریں۔

۸۔ جو لوگ نظام جماعت میں شامل ہوں ان کو ان کے حالات کے لحاظ سے ابتداءً تین طبقوں میں تقسیم کیا جائے گا:-

ایسے اشخاص جو تن من دھن سے جماعت میں شریک ہوں، جو اسلامی نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں ہر قربانی کے لئے تیار ہوں، جو اپنے آپ کو بلا کسی استحفاظ و استثناء کے اس طرح جماعت کے حوالہ کریں کہ جب ان کو پکارا جائے، لبیک کہیں، جو خدمت ان کے سپرد کی جائے انجام دیں، اور جان، مال، اولاد، عزیز، اقارب، دوست غرض کسی چیز کو بھی مقصد اسلامی سے زیادہ عزیز نہ رکھیں، وہ صف اوّل کے لوگ ہوں گے، جماعت کا اصل کارکن و کار فرما عنصر یہی ہوں گے، اور رہنمائی و سربراہ کاری انہی کے ہاتھ میں ہوگی۔ ان لوگوں کے لئے احکام شرعیہ کی پابندی کے معاملہ میں کوئی رعایت نہ ہوگی۔ ان کو مسلمان کی زندگی کا پورا نمونہ پیش کرنا ہوگا اور ان کے لئے رخصت کے بجائے عزیمت کا طریقہ ہی قانون ہوگا۔ نیز ان کے لئے لازم ہوگا کہ کسی غیر الٰہی عدالت میں مستغیث یا مدعی کی حیثیت سے نہ جائیں، مدعی علیہ یا مستغاث علیہ کی حیثیت سے خاص حالات میں جا سکتے ہیں جبکہ غیر معمولی نقصان کا خطرہ ہو، البتہ سرِدست گواہ کی حیثیت سے اگر ان کو طلب کیا جائے تو وہ جائیں۔

وہ لوگ جو اپنے آپ کو بالکلیہ وقف کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور نہ خطرات اور قربانیوں کا پورا

ملے دفتر ترجمان القرآن، پونچھ روڈ، مبارک پارک، لاہور

پورا بار اُٹھا سکتے ہوں، مگر اپنے وقت، اپنے مال اور اپنی قوتوں کا ایک حصہ اپنی ذات کی خدمت سے بچا کر راہ خدا میں دینے کے لئے تیار ہوں وہ طبقہ دوم میں شمار ہوں گے بشرطیکہ اپنی شخصی زندگی کی حد تک احکام دین کی پوری اطاعت کریں، ان وسائل کسب رزق اور مشاغل سے مجتنب ہو جائیں جو براہ راست دین حق کے خلاف ہیں اور صدق دل سے جماعت اسلامی کے خیر خواہ و وفادار ہوں۔ جماعت کی طرف سے ان کے سپرد وہی خدمات کی جائیں گی جن کو وہ خود بخوشی قبول کریں۔ ذمہ داری کا کوئی منصب ان کے سپرد نہ کیا جائے گا۔ اور جماعتی مشوروں میں وہ شریک ہو سکیں گے۔

جو لوگ کلمۂ اسلام پر اصولی حیثیت سے ایمان لائیں اور شخصی زندگی کی حد تک احکام شرعی کی پابندی بھی قبول کریں، مگر غیر الٰہی نظام سے اُن کے جو مفاد وابستہ ہیں اُن کا نقصان گوارا نہ کر سکیں وہ طبقۂ سوم میں داخل ہوں گے۔ اور ان کا شمار ہمدردوں میں ہو گا۔ بشرطیکہ وہ دوسری وفاداریوں پر خدا کی وفاداری کو مقدم رکھیں، غیر الٰہی نظام میں ترقی درجات کیلئے کوشاں نہ ہوں، اور جماعت اسلامی کو ہر جائز امکانی طریقہ سے مدد دیں۔ جماعتی مشورہ میں وہ صرف اس حد تک شریک ہو سکتے ہیں جس حد تک جماعت کو ان کے خلوص پر اعتماد ہو۔

تشریح:۔ طبقات کی یہ تقسیم تمام اشخاص کے حق میں دائمی و ابدی نہ ہو گی بلکہ شخصی حالات کے تغیر و تبدل کے ساتھ بدلتی رہے گی۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی طبقہ سوم کے ایک شخص کی حالت بدل جائے اور وہ طبقۂ اوّل میں آ جائے اور علیٰ ہذا القیاس اس کے برعکس۔

عورتوں کی حیثیت

۹۔ جو عورتیں جماعت اسلامی میں داخل ہوں ان پر دفعہ چہارم اور دفعہ پنجم کے تمام اُن اجزاء کا اطلاق ہو گا جو مخصوص طور پر مردوں سے متعلق نہیں ہیں یعنی جو تمام اہل ایمان کے لئے عمومی نوعیت رکھتے ہیں۔

۱۰۔ رکن جماعت ہونے کی حیثیت سے عورتوں کے فرائض حسب ذیل ہوں گے:۔

(الف) اپنے خاندان اور اپنے حلقۂ تعارف میں دوسری عورتوں کو تجدید ایمان یا قبول ایمان کی دعوت دیں

(ب) اپنے شوہروں، بھائیوں اور خاندان کے دوسرے مردوں پر دین کی تبلیغ کریں۔

(ج) اپنے بچوں کے دلوں میں نور ایمان اور اخلاق اسلامی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

(د) اگر ان کے شوہر یا بیٹے یا باپ اور بھائی جماعت اسلامی میں داخل ہوں تو اپنی صابرانہ رفاقت سے اُن کی ہمت افزائی کریں اور جماعت کے نصب العین کی خدمت میں حتی الامکان ان کا ہاتھ بٹائیں اور نزول مصائب کی صورت میں صبر و ثبات سے کام لیں۔

(ہ) اگر ان کے شوہر یا اولیاء جاہلیت میں مبتلا ہوں، حرام کماتے ہوں، یا معاصی کا ارتکاب کرتے ہوں تو صبر کے ساتھ ان کی اصلاح کے لئے ساعی رہیں۔ اُن کی حرام کمائی سے اور ان کی ضلالتوں سے محفوظ رہنے کی انتہائی کوشش کریں، اور ان کے ایسے احکام کو ماننے سے انکار کر دیں، جو معصیت خدا اور رسول کے مترادف ہوں بلا اس لحاظ کے کہ ان کی حکم عدولی کے نتائج کتنے ہی بُرے ہوں۔

امارت

۱۰۔ اس جماعت کا ایک امیر ہو گا جس کی حیثیت "امیر المومنین" (باصطلاح معروف) کی نہ ہو گی بلکہ صرف اس جماعت کے رہنما کی ہو گی۔ اس کی اطاعت فی المعروف جماعت کے کل افراد اپنے امیر (باصطلاح شرعی) کی حیثیت سے کریں گے۔ امیر کے انتخاب میں تقویٰ، علم دین، بصیرت، اصابت رائے، اور عزم و حزم کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ جماعت کی دعوت اپنے عقیدہ اور نصب العین کی طرف ہو گی نہ کہ اپنے امیر کی شخصیت اور اس کی امارت کی طرف۔ جماعت کی نظر میں انتخاب کے وقت جو شخص بھی مذکورۂ بالا اوصاف کے لحاظ سے اہل تر ہو گا اس کو وہ اس منصب کے لئے منتخب کرے گی۔

امیر کی خدا ترسی و احساس ذمہ داری سے یہ توقع کی جائے گی کہ اپنے سے زیادہ اہل آدمی کے آجانے پر وہ خود اس کے لئے جگہ خالی کر دے گا۔ نیز ایسی صورت میں جبکہ جماعت اپنے نصب العین کے مفاد کے لئے ضرورت محسوس کرے، وہ امیر کو معزول کرنے کی بھی مجاز ہو گی۔

ابتدائی لائحہ عمل

(۱۱) جماعت کا ابتدائی پروگرام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک طرف اس میں شامل ہونے والے افراد اپنے نفس اور اپنی زندگی کا تزکیہ کریں، اور دوسری طرف جماعت سے باہر جو لوگ ہوں (خواہ وہ قومی مسلمان ہوں یا غیر مسلم) ان کو بالعموم حاکمیت غیر اللہ کا انکار کرنے اور حاکمیت رب العالمین کو تسلیم کرنے کی دعوت دیں۔ اس دعوت کی راہ میں جب تک کوئی قوت حائل نہ ہو، ان کو بھی چھیڑ چھاڑ کی ضرورت نہیں۔ اور جب کوئی قوت حائل ہو، خواہ وہ کوئی قوت ہو، تو ان کو اس کے علی الرغم اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرنی ہوگی اور اس تبلیغ میں جو مصائب بھی پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔

بعد کے مراحل کے متعلق اس وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جیسے حالات پیش آئیں گے انہی کے لحاظ سے قدم اٹھایا جائے گا۔ البتہ لوگوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مضبوط جمے ہوئے اور زمین پر چھائے ہوئے دین (نظام اطاعت غیر اللہ) کو اکھاڑ کر دوسرا دین (نظام اطاعت الٰہی) کو قائم کرنا بہرحال آسان کام نہیں ہے۔ اس میں جان، مال اور ہر چیز کا زیاں ہے۔ لہٰذا وہی لوگ آگے بڑھیں جو تمام فائدوں اور آسائشوں کی قربانی اور تمام نقصانات کی برداشت کے لئے تیار ہوں۔

چند نایاب اسلامی کتب اور ان کی قیمتوں میں حیرت انگیز رعایت

(۱) تفسیر القرآن مکمل ۸ جلدوں میں (اردو) اصلی قیمت اکیس روپے رعایتی قیمت دس روپے
(۲) جواہر قرآنی (اردو) مصنفہ علامہ شیخ طنطاوی جوہری مصری اصلی قیمت ایک روپیہ رعایتی دس آنے۔
(۳) سیرت رسول (اردو) سیرۃ النبی معروف بہ سیرت ابن ہشام کا اردو ترجمہ رعایتی قیمت مکمل سٹ ایک روپیہ چار آنے
(۴) تاریخ اسلام (اردو) مصنفہ رائٹ آنریبل سید امیر علی رعایتی قیمت دو روپے۔
(۵) کلید خزائن قرآنی کسی آیت کا ایک لفظ یا کلمہ یاد ہو تو اس کی مدد سے پوری آیت معہ نشان سورہ و تعداد آیت مل جاتا ہے۔ رعایتی قیمت چار روپے۔

محصول ڈاک ہر کتاب کا بذمہ خریدار ہوگا۔ مکمل فہرست کتب مفت طلب کریں۔

مینجر "ایشیا" ڈاک خانہ وطن۔ لاہور

رسالۂ دینیات

رسالۂ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے
میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہو
سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شر
کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خ
نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا

قیمت ۱۲؍ محصولڈاک ۲؍ خرچ وی پی ۳؍

TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM

BY

SAYYID ABUL-ALA MAUDUDI

is small book is an attempt at a clear and concise interpretation of Islam. hief aim in view has been to present within a brief space the most systema- d logical conception of Islam to build a coherent and organic structure of ı life on the basis of this conception and to give a comprehensive and account of what this religion in reality is.

Price 1-8-0

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

سرحد ترقی پرنٹنگ پریس مل روڈ لاہور میں طبع ہوا

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بے گناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلوار بند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کماحقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے [illegible] محصولڈاک

دفتر رسالہ ترجمان القرآن۔ لاہور